عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

اپریل ۱۹۳۹

ایک روپیہ

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام
کراچی

مرتب
محمد یونس

بدلِ اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے
خرچ رجسٹری سالانہ
تین روپے

جلد ۲
کراچی ۔ اپریل ۱۹۴۹ء
نمبر ۴

فہرست

۱	لمعات	۱
۲	رفتارِ عالم	
۳	مقدمہ معارف القرآن	۱۷
۴	مغضوب اسرائیلیوں کی ریاست — محترم حافظ نذر احمد صاحب	۳۴
۵	اسبابِ زوالِ اُمت — علامہ اسلم جیراجپوری	۴۶
۶	جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے	
۷	باب المراسلات	۵۵
۸	دربار نبی (مسلم لیگ کی تنظیم جدید)	۶۳
۹	وراثتِ ارض کا ابدی قانون — محترم اسعد ملتانی	۶۵
	محترم پرویز صاحب	۹۵-۹۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

لمعات

"پاکستان کے آئین کی اساس کیا ہوگی؟"

یہ تھا وہ سوال جو حصول پاکستان کے بعد دوست دشمن کی زبان پر تھا۔ دوستوں کی زبان پر اس لئے کہ جن حسین تمناؤں اور تابندہ آرزوؤں کو سامنے رکھکر مسلمانانِ ہندوستان نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا، ان کی عملی تشکیل کو مشہود و محسوس پیکر میں بے نقاب دیکھنا ان کے لئے عید نظارہ تھا اور اس میں کسی قسم کی تاخیر باعث ہزار اضطراب۔ دشمنوں کی زبان پر اس لئے کہ وہ اس ابہام سے لوگوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے تاکہ انھیں اپنے مشئوم و مذموم عزائم کے بروئے کار لانے میں تائید حاصل ہو جائے۔ ادھر یہ کچھ تھا اور اُدھر ارباب اقتدار کی طرف سے ایک ہوش ربا خاموشی۔ بہرحال مقام صد مسرت و ہزار تشکر ہے کہ ان کے لب سے مہر سکوت ٹوٹی اور ۷ مارچ کو ایوان مجلس آئین ساز میں محترم وزیر اعظم نے قرار داد مقاصد کو پیش کر دیا اور اس طرح وہ قدم جو تشکیل پاکستان کے بعد اولین فرصت میں اٹھانے کا تھا قریب پونے دو سال کے صبر آزما تذبذب و جاں گسل کشمکش کے بعد اٹھا لیا گیا۔ ہم اس مرحلۂ عدم فیصلہ کے اختتام پذیر ہو جانے پر حکومت کو مبارکباد دیتے ہیں۔

آپ شاید حیران ہوں کہ ہم نے صرف اس مرحلۂ تذبذب و کشمکش کے انقطاع کیلئے حکومت کو قابل مبارکباد کہا ہے خود نفس قرارداد پاس کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش نہیں کیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اگر ایک مسلمان یہ کہے کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کے احکام کے اتباع کو اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ تو ہم نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی ایسا اعلان ہو جس پر چاروں طرف سے غلغلہ ہائے تحسین و ستائش بلند ہوں۔ ایک مسلمان کی طرف سے یہ اعلان نہ غیر متوقع ہونا چاہیئے نہ کسی کارنمایاں کی دلیل۔ اس کا مسلمان ہونے کا اقرار اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ خدا کے احکام کی اتباع اس کا فریضۂ زندگی ہے۔ وجۂ حیرت و استعجاب اس کا اس اعلان (اعتراف) سے سکوت ہے نہ کہ اس کا اظہار۔ اس لئے اگر مسلمانوں کی ایک مملکت نے اس کا اعلان کیا ہے کہ ان کا آئین، حدود اللہ کے تابع ہوگا تو یہ کونسا غیر متوقع واقعہ ہے جس کے سبب انھیں مستوجب تبریک و تہنیت سمجھا جائے۔ محترم قائد اعظم (مغفور و مرحوم) نے جب کہا تھا کہ "میں تو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ یہ سوال ہی کیوں اٹھایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے آئین کا مدار کیا ہوگا۔ مسلمان اپنے لئے اسلام سے الگ اور کونسا آئین بنائیں گے"؟ تو انھوں نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ البتہ اس حقیقت کے پیش نظر یہ تقریب فی الواقعہ مستحق ہزار تبریک و تہنیت اور سزاوار صد ہزار تحسین و ستائش ہے کہ مسلمانانِ پاکستان نے اپنے اس وعدہ کے ایفا کا عزم ظاہر کیا ہے، جس کی بنا پر انھوں نے خدا سے آزادی کی نعمت مانگی تھی اور اس کی ذاتِ صمدیت نے یہ نعمت یوں ارزاں فرمائی تھی۔ یہ اعلان، اظہار سپاس گذاری ہے، اس نعمت عظمیٰ کی موہبت پر۔

جہاں تک نفسِ قرارداد کا تعلق ہے، ہم چاہتے تھے کہ وہ اس سے زیادہ واضح اور معین ہوتی۔ یہ دنیا کے سامنے ایک عظیم الشان انقلاب کا اعلان ہے اور اس قسم کے اعلانات کو کبھی مبہم اور غیر معین نہیں ہونا چاہئے۔ آج دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ انسانی معاملات صرف عقلِ انسانی اور اس کے تجربات کی رو سے طے پانے چاہئیں۔ ان میں فوق الفطرت عنصر (Super-natural element) لانے کی ضرورت نہیں۔ ایسا اقدام اس دورِ علم و عقل میں، رجعتِ قہقری ہے۔ لہٰذا ہمارا یہ اعلان بڑا واضح اور روشن ہونا چاہئے تھا۔ لیکن خیر یہ چیزیں اس اصول کی عملی تشکیل کے وقت واضح کی جا سکتی ہیں۔ سب سے بڑی کمی دراصل اس تقریر میں ہے جس کے ساتھ یہ قرارداد پیش کی گئی اور اس کے بعد اس سے متعلقہ بحث و تمحیص کو چکایا گیا۔ اس تقریر میں ہمیں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے تھا کہ ہماری مخاطب دنیا کی تمام اقوام و ملل ہیں جنہیں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے وہ ہیں لاقوامی مسائل جو اس وقت اس بری طرح سے ان کے گلوگیر ہو رہے ہیں، کس طرح اس محکم اصول کے ماتحت خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے جسے ہم دنیا کے معمل سیاست میں ایک انوکھے تجربہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کہ یہ نظام دنیا کے تمام مصائب و نوائب کا حل اپنے اندر رکھتا ہے، کافی نہیں ہو سکتا۔ یہ دعوے تو دنیا کا ہر نظام کرتا ہے۔ بتانے کی بات تو یہ تھی کہ دیگر نظامہائے عالم کس طرح ان دعاوی میں ناکام ہوئے ہیں اور یہ نظام کس طرح اپنے اس دعوے میں پورا اتر سکتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ کمی وہ تھی جس کی طرف غیر مسلم اراکینِ مجلس نے بار بار مختلف مظاہر میں اشارہ کیا۔ یعنی یہ کہ دنیا نے اسلام کا ایک خاص مفہوم سمجھ رکھا ہے اور وہ مفہوم انھوں نے متعین کیا ہے مسلمانوں کی تاریخ سے۔ سوال یہ ہے کہ جس نظام کو ہم پیش کر رہے ہیں وہ وہی ہے جسے دنیا نے آج تک اسلامی نظام سمجھ رکھا ہے یا اس سے مختلف۔ اگر وہ وہی ہے تو غیر مسلموں کے تمام شکوک و شبہات، بلکہ ان کا خوف و ہراس، سب بجا ہے۔ اور اگر یہ نظام وہ نہیں ہے، تو اس کی وضاحت ہمارے ذمہ تھی کہ جس نظام کو ہم اسلامی نظامِ مملکت کہتے ہیں، اس کے حقیقی خدوخال کیا ہیں اور وہ کس طرح اس نظام سے مختلف ہے جس کا تصور اقوامِ عالم کے ذہن میں مرتسم ہے اور جو ان کے لئے اس طرح وجہِ رعشہ براندام ہے۔ اس وضاحت کے بغیر، غیر مسلم معترضین کو ان کے شکوک و شبہات اور خوف و ہراس پر مورد الزام گردانتا یکسر بیجا ہے۔ معترضین کی نیت کچھ ہی ہو لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسلام کے صحیح نظام کی اصل تصویر غیر مسلم تو ایک طرف، خود مسلمانوں کے ذہن میں بھی بہت کم ہے۔ سو جب واقعہ یہ ہے تو کیا اس کی وضاحت ہمارے ذمہ نہیں؟ اس وضاحت کے تین اسلوب ہو سکتے ہیں۔ یا ہم انہیں بتا دیں کہ (i) فلاں جگہ اس کی صحیح تفسیر موجود ہے وہاں سے پڑھ لیجئے۔ یا یہ کہ (ii) فلاں مقام پر یہ عملی طور پر کارفرما ہے۔ اسے دیکھ لیجئے۔ اور یا یہ کہ (iii) اس کی صحیح تعبیر یہ ہے جو اب پیش کی جاتی ہے۔ پہلی دو صورتیں مرفوع القلم ہیں۔ نہ ہمارے ہاں ایسا مستند لٹریچر ہے جسے ہم حتمی طور پر اسلامی نظام کی صحیح اور حقیقی تعبیر کے لئے پیش کر سکیں۔ نہ دنیا کے کسی خطہ میں آج یہ نظام عملی طور پر کہیں موجود ہے۔ اس لئے تیسری شق کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اس لئے اس کی وضاحت ناگزیر اور لابدی تھی۔ غیر مسلم تو ایک طرف، خود مسلمانوں کے ذہن میں بھی اس کی "اپنی اپنی تصویریں" ہیں۔

ہمیں مختلف گوشوں سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ ہم اس کی صحیح تعبیر متعین کر کے پیش کریں لیکن تقاضا کرنے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کام افراد کا نہیں، حکومت کا ہے۔ دنیا صرف اسی تعبیر کو مستند سمجھے گی جو حکومت کی طرف سے پیش کی جائے گی۔

ہم اس قرارداد یا اس سے متعلقہ تقریر پر تفصیلی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس تبصرہ یا تنقید کی ضرورت اسوقت پیش آئے گی جب اس اصول کو عملی شکل میں متعین کیا جائے گا۔ البتہ ان میں چند نکات ایسے ہیں جن کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔

(۱) سب سے پہلے جس چیز نے ذہنوں میں انتشار پیدا کر دیا وہ اس قرارداد کا پہلا فقرہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> چونکہ کل کائنات کا حاکم مطلق خدا ہے، اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر اختیارِ حکمرانی تفویض فرمایا ہے (Has delegated)
>
> اور چونکہ یہ اختیار ایک مقدس امانت ہے، لہٰذا . . . .

اس فقرہ سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اختیارِ حکمرانی خدا کو حاصل ہے، یا جمہور کو یا مملکت کو؟ جواب یہ دیا گیا کہ اختیارِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس نے یہ اختیار جمہور کو تفویض کر دیا ہے اور جمہور نے مملکت کو۔ اس طرح سے یہ جواب ایک لفظی گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔ یہ اصولاً غلط ہے کہ خدا نے اپنے اختیارات انسان کو تفویض (Delegate) کر دیئے ہیں۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو (delegate) نہیں کرتا۔ یہ وہ غلط نظریہ ہے جس پر (Theocracy) کی عمارت قائم ہوئی تھی اور جس کی اسلام میں کہیں گنجائش نہیں۔ اسلامی اصولِ مملکت صاف الفاظ میں یہ ہے کہ

> (۱) مملکت کے آئین کی اصولی چار دیواری (حدود) مستقل اقدار پر قائم ہے جو مقتضیاتِ زمانہ یا انسانی میلانات و عواطف سے تغیر پذیر نہیں ہوتیں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی مملکت کا اصولی آئین، اقدارِ مستقلہ (Fundamental, permanent values) کے تابع رہتا ہے مصالحِ وقت (Expediency) کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔
>
> (۲) یہ مستقل اقدار ذاتِ خداوندی نے متعین کی ہیں کیونکہ اس کی ذات تغیرات سے بلند ہے اور وہی مستقل اقدار دے سکتی ہے۔
>
> (۳) یہ اقدار قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں، ان میں تغیر و تبدل کرنے کا اختیار کسی کو تفویض نہیں کیا گیا۔
>
> (۴) ان حدود (مستقل اقدار) کے اندر ملتِ اسلامیہ پورے طور پر خود مختار ہے کہ اپنا آئین (Constitution) اور قانون (Laws) خود وضع کرلے۔

(۲) پھر یہ کہا گیا ہے کہ

اس میں اصولِ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کو اسلامی تشریح کے مطابق ملحوظ رکھا جائے گا۔

جمہوریت، مساوات، حریت وغیرہ ایسی اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم مغرب کے علم سیاست مدن (Political science) نے متعین کر رکھا ہے۔ جب ہم ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں تو ذہن فوراً اسی مفہوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن قرارداد میں یہ کہا گیا ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم وہ نہیں جسے مغرب نے متعین کر رکھا ہے بلکہ ان کا منطوق وہ ہے جس کی تشریح اسلام نے کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مخاطب ان تشریحات کو کہاں سے معلوم کرے؟ وہ کیا سمجھے کہ آپ ان اصطلاحات سے کیا مفہوم لیتے ہیں؟

(۳) پھر کہا گیا ہے۔

جس کی رو سے بنیادی حقوقِ انسانیت کی حفاظت کی جائے گی۔ وہ حقوق جن میں قانون و اخلاقِ عامہ کے ماتحت مساواتِ حیثیت و مواقع۔ قانون کی نظروں میں برابری۔ عمرانی۔ اقتصادی اور سیاسی عدل۔ خیال۔ اظہارِ خیال۔ عقیدہ۔ پرستش اور ارتباط کی آزادی شامل ہے۔

بنیادی حقوقِ انسانیت (Fundamental human rights) کا مسئلہ ایسا آسان نہیں ہے کہ اسے اس طرح غیر متعین طور پر بیان کر دیا جائے۔ ان کے لئے بڑے حدود و ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) آگے چل کر کہا گیا ہے کہ

خدا شناسی ہی انسانیت کو تباہی سے بچا سکتی ہے جس کا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان کو جو قوتیں حاصل ہیں ان سب کو ایسے اخلاقی معیاروں کے مطابق استعمال کرنا لازمی ہے جو وحی سے فیض یاب ہونے والے ان معلموں نے معین کئے ہیں جنہیں ہم مختلف مذاہب کے جلیل القدر پیغمبروں کی حیثیت سے مانتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ "اخلاقی معیار" جو مختلف مذاہب کے پیغمبروں نے معین کئے تھے آج کہاں ہیں؟ انجیل کے اس اخلاقی معیار کہ "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دو" اور تورات کے اس اخلاقی معیار کہ "دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ" میں سے کونسا معیار مستقل قدر کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے گا؟ یاد رکھئے! یہ معیار آج قرآن کے باہر کہیں بھی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ اور ہمارا یہ دعوے محض عقیدت پر مبنی نہیں، علمی شواہد اور تاریخی تائیدات پر مبنی ہے جسے ہم ہر وقت ثابت کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کے اعلان میں کبھی شرمانے کی ضرورت نہیں۔ "برہمو سماجی" قسم کا اسلام (کہ عالمگیر سچائیاں

تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں) دورِ حاضر کا بہت بڑا فتنہ ہے جسے مسٹر گاندھی نے ابوالکلامی تائیدات کے زور پر مسلمانوں کے لئے وجہِ نظر فریبی بنانے کی انتھک کوشش کی۔ طلوع اسلام کے مجلدات اس سحرسامری کی تردید کی زندہ شہادات ہیں۔

(۵) اس سے آگے ایک ایسا تضاد ہے جس میں وجہِ تطبیق و توفیق سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک جگہ ارشاد ہے

> (الف) آپ اس امر کو بھی مدنظر رکھیں کہ حکومت ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے اس امر پر اکتفا نہیں کرے گی کہ مسلمانوں کو اس مملکت میں صرف اپنے مذہب کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ . . . . مملکت ایک ایسا ماحول پیدا کرے گی جو ایک حقیقی معاشرہ کی تعمیر میں ممد و معاون ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کو اپنی مساعی میں مثبت پہلو اختیار کرنا ہوگا۔

اور دوسری جگہ

> (ب) مملکت ایک ایسا اسلامی معاشرہ پیدا کرنے کی سعی کرے گی جو باہمی تنازعات سے مبرہ ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اعتقادات کے معاملہ میں وہ مسلمانوں کے کسی طبقہ کی آزادی کو سلب کرے گی۔ کسی فرقہ کو خواہ وہ اکثریت میں ہو خواہ اقلیت میں۔ یہ اجازت نہیں ہوگی کہ دوسروں کو اپنا حکم قبول کرنے پر مجبور کرے اور اپنے اندرونی معاملات اور فرقہ دارانہ اعتقادات میں تمام فرقوں کو کامل آزادی اور وسعت حاصل ہوگی۔

یعنی یہ فرقے جنہیں قرآن نے شرک قرار دیا ہے، بدستور قائم رہیں گے اور اس تحزب و تفرق کے باوجود ایک "اسلامی معاشرہ" وجود میں آجائے گا۔ ہر فرقہ اپنے اپنے عقائد علیٰ حالہ قائم بھی رکھے گا اور مملکت ایک غیر جانبدارانہ تماشائی کی حیثیت سے محض منفیانہ پہلو پر اکتفا نہیں کرے گی، مثبت پہلو بھی اختیار کرے گی! ان اختلافات کی سند میں ارشاد ہے کہ

> درحقیقت ہمیں یہ امید ہے کہ مختلف فرقے اس عمل کے مطابق عمل کریں گے جو اس حدیث نبوی میں مذکور ہے کہ میری امت کے لوگوں میں اختلاف رائے ایک نعمت ہے۔

"اختلاف رائے" اور چیز ہے اور "اختلاف" اور چیز۔ فرقہ بندی اور گروہ سازی' اختلاف رائے سے وجود میں نہیں آتی، اختلاف سے پیدا ہوتی ہے جسے قرآن نے، علم الٰہی آجانے کے بعد' دین میں بدترین جرم قرار دیا ہے۔ اختلاف رائے صرف مجلس شوریٰ تک محدود ہوتا ہے۔ جب مجلس کسی فیصلہ پر پہنچ جاتی ہے تو اس فیصلہ کو سب کو تسلیم کرنا ہوتا ہے۔ پھر کسی قسم کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔

اور اگر آپ کہیں کہ "مذہبی عقائد" میں اختلاف برقرار رکھے جا سکتے ہیں لیکن امور سیاست میں نہیں۔ تو یہ مذہب و سیاست کی وہی تفریق ہے جسے یکسر غیر اسلامی قرار دیا جاتا ہے (اور جو فی الحقیقت غیر اسلامی

تفریق ہے) گویا مذہب و عقائد کے اختلافات کے باوجود آپ ایک ایسا نظام سیاست وضع کر سکتے ہیں جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو۔ اس کا نام وہ (... Secular State) ہے جسے ہندوستان اپنے ہاں قائم کر رہا ہے!

(۴) اس تقریر میں سب سے زیادہ کمزور اور افسوسناک مقامات وہ ہیں جہاں اسلامی نظام کے نتائج حسنہ کی تائید میں مسلمانوں کی تاریخ کو استشہاداً پیش کیا گیا ہے۔ ان مقامات سے مترشح ہوتا ہے کہ یا تو فاضل مقرر کو مسلمانوں کی تاریخ سے واقفیت نہیں یا وہ غیر شعوری طور پر اس اعتراض سے گھبرا رہے ہیں کہ اگر اسلامی نظام فطرتِ انسانی کے مطابق اور ایسے درخشندہ نتائج کا ضامن تھا تو وہ آگے کیوں نہ چل سکا۔ بہرحال، وجہ کچھ بھی ہو یہ حصہ ایسا ہے جس پر علمی دنیا ہنسے گی اور اسے ابلہ فریبی پر محمول کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے۔

> اسلام، نسل۔ رنگ اور نسب کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ انحطاط کے دور میں بھی اسلامی معاشرہ ان تعصبات سے نمایاں طور پر پاک رہا ہے جنھوں نے دنیا کے دوسرے حصوں میں انسانوں کے باہم تعلقات کو زہر آلود کر دیا تھا۔

اگر آپ سے کوئی مورخ یہ دریافت کرے کہ وہ "اسلامی معاشرہ" کہاں تھا جو اپنے دورِ انحطاط میں نسل، رنگ نسب کے امتیازات سے پاک اور بلند تھا تو کیا آپ اس کا کوئی پتہ نشان بتا سکتے ہیں! اوروں کے ہاں کی بات تو چھوڑیئے۔ کیا آپ آج خود پاکستان کو بھی اس کی نظیر میں پیش کر سکتے ہیں!۔

پھر ارشاد ہے۔

> اسی طرح ہماری رواداری کی روایات بھی عظیم الشان ہیں..... جس زمانہ میں کلیسا سے اختلاف رکھنے والے مسیحیوں اور مسلمانوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں، انھیں گھروں سے نکالا جاتا تھا، انھیں جانوروں کی طرح شکار کیا جاتا تھا، اور انھیں مجرم قرار دے کر زندہ جلا دیا تھا، اسلام ان سب کا مامن و ملجا ثابت ہوا جنھیں مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور جو تنگ آکر بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ زندہ جلانے کا تو تصور بھی اسلامی سوسائٹی میں کبھی نہیں آیا۔

اے کاش ہمارے فاضل وزیر اعظم مسلمانوں کے تاریخ کی کوئی ابتدائی کتابیں ہی دیکھ لیتے تو ہم علمی دنیا میں اس طرح سبک نہ ہوتے۔ ہماری پوری تاریخ چھوڑیئے۔ تاریخ کا پورا دور بھی چھوڑیئے۔ عباسیہ خاندان کے صرف ایک مامون الرشید کو لیجئے جس کا عہد مسلمانوں کی تہذیب و ترقی کا درخشندہ دور کہا جاتا ہے۔ اس میں صرف اس عقیدہ کے اختلاف پر کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق، بغداد کی گلیوں میں جس قدر بے گناہ خون بہایا گیا، وہی ہمارے ڈوب مرنے کے لئے کافی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ جیسے جلیل القدر بزرگ کو

قریب اڑھائی برس تک مختلف نوعیتوں کا عذاب دیا جاتا رہا۔ جب وہ کوڑے کھا کھا کر بیہوش ہو جاتے تو پھر قیدخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پابجولاں بند کر دیا جاتا اور جب ہوش آتا تو پھر پیٹنا شروع کر دیا جاتا۔ باقی رہا زندہ جلانا۔ تو آپ نے غالباً بصرہ کے گورنر زید کا نام نہیں سنا۔ جنہوں نے اس قدر آدمیوں کو آگ میں جلا کر سزائیں دی تھیں کہ ان کا لقب ہی زید النار مشہور ہو گیا تھا۔

ہم ان جگرخراش واقعات کو دہرا کر لذت نہیں لے رہے۔ خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ مقصد ہمارا صرف یہ ہے کہ ہماری تاریخ کے بیشتر گوشے قطعاً اس قابل نہیں کہ ہم انہیں دنیا کے سامنے فخر سے پیش کر سکیں خصوصیت سے انہیں اسلامی نظام کا نام دے کر۔ اسلامی نظام اور اس کے درخشندہ نتائج کا دور صرف وہ ہے جس میں محمد رسول اللہ والذین معہ نے اس نظام کو عملی شکل میں متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ یہ کس طرح انسانیت کو حیات نو عطا کر دیتا ہے۔ اس عہد مبارک کی تاریخ بھی یقینی طور پر تمام کی تمام صحیح نہیں۔ اس لئے ہمیں کہنا صرف یہ چاہیے کہ یہ نظام قرآن کے اندر محفوظ ہے جو ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہے۔ باقی رہی تاریخ، سو اس میں جو واقعات اس تعلیم کے مطابق ہیں وہی "اسلامی تاریخ" کہلا سکتے ہیں۔ باقی تاریخ مسلمانوں کی ہے جو اسلامی نظام کو چھوڑ کر انہی خرابیوں میں مبتلا ہو چکے تھے جن میں باقی دنیا ماخوذ تھی۔ ان کے اعمال کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ ہم وہ نظام قائم کریں گے جو ہمارے خدا نے ہمیں عطا فرمایا ہے اور اس کے نتائج دنیا خود دیکھ لیگی۔

(۷) بعض باتیں ایسی بھی کہی گئی ہیں جو یا تو عدم ناواقفیت کا نتیجہ ہیں یا مبنی بر مداہنت۔ مثلاً حزب مخالف کے لیڈر، مسٹر چٹو پادھیائے نے جب پوچھا کہ کیا اسلامی نظام میں رئیس مملکت (Head of the State) غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہاں! ایسا ہو سکتا ہے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

ہمیں حیرت اور تاسف اس جواب پر نہیں ——— میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز ——— حیرت اور قلق اس پر ہے کہ یہی وہ لوگ جنہوں نے اسلامی آئین کو مرتب کرنا ہے۔

بہرحال مجلس آئین ساز نے اس قرارداد کو منظور کر دیا۔ کسی مقصد کی تکمیل کے لئے تین مراحل لاینفک ہوتے ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ہے کہ وشاورھم فی الامر۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ پہلا مرحلہ مشاورت کا ہے۔ دوسرا فیصلہ کا جسے عزم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انگریزی کا لفظ ریزولیشن (Resolution) اسی کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں مراحل طے ہو چکے ہیں۔ باہمی مشاورت کے بعد ریزولیشن پاس ہو گیا ہے۔ اب اس کے بعد اللہ کے بھروسے پر کام شروع ہو جانا چاہئے۔ یہی اصل مرحلہ ہے۔ جو لوگ پہلے وساوس انگیزیاں کرتے تھے، اب بھی کہتے ہیں کہ یہ قرارداد محض کمیونزم کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے بطور ایک

تعویذ کے پاکستان کے دروازہ کے باہر لٹکا دی گئی ہے کہ اس سے گھر کے اندر آفات و بلیات داخل نہ ہونے پائیں۔ ورنہ ان کا دلی ارادہ کچھ کرنے کرانے کا ہے نہیں۔ نیتوں کا حال خدا جانتا ہے، اس لئے اس بنا پر بدظنی پیدا کرنا غلط ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد کی بعض حرکات ان بدظنیوں کو تقویت دینے کا موجب بن جاتی ہیں۔ مثلاً ابھی اگلے دنوں محترم لیاقت علی خاں صاحب نے بھاولپور میں فرمایا ہے کہ

> مجلس آئین ساز نے مقاصد کی قرارداد منظور کرکے، اسلامی اصولوں کے مطابق آئین مرتب کرنے کی راہ ہموار کردی ہے۔ اب مسلمانان پاکستان کو ثابت کردینا چاہئے کہ وہ سچے معنوں میں مسلمان ہیں اور (یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ) وہ اپنی زندگیوں کو احکام اسلامی کے قالب میں ڈھال لیں۔ (ڈان ۲۵ مارچ)

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قرارداد کے پاس ہو جانے سے کونسی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جس کی رو سے وہ مسلمان جو اب تک اپنی زندگیوں کو اسلامی احکام کے تابع نہیں رکھ رہے تھے اب انہیں فوراً اسلامی قالب میں ڈھال لیں گے؟ پھر یہ بھی کہ اگر یہ حضرات چاہتے ہیں کہ مسلمان فی الواقعہ اپنے اندر اسلامی انداز کی تبدیلی پیدا کرلیں تو اس کے لئے سب سے پہلے ان ارباب بست وکشاد کو خود اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کرنا چاہئے۔ عوام ہمیشہ خواص کے مقلد ہوتے ہیں۔ یہاں خواص کی یہ حالت ہے کہ کھلے بندوں احکام قرآن کی خلاف ورزی کی جاتی ہے اور اس معصیت کوشی پر ان کے نام جلی حرف میں لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً ۲۲ مارچ کے ڈان کے پہلے صفحہ پر یہ خبر فی الواقعہ جلی حروف سے شائع ہوئی ہے کہ

> سوموار کی شام ریڈ کراس کا مینا بازار ایک خاص جاذبیت کا مرکز بن گیا جب بیگم لیاقت علی خاں نے منتظر نگاہوں کے سامنے، ریڈ کراس کی لاٹری نکالی۔

لاٹری، کھلی ہوئی قماربازی اور قرآن کی رو سے عمل الشیطان ہے۔ جسے حکومت اسلامی کے دارالسلطنت میں امراء و وزراء سلطنت کی تائید و شمولیت سے، مملکت کی بلند ترین خاتون کی زیر سرپرستی، یوں وجہ جاذبیت عوام بنایا جاتا ہے اور پھر اس کارنمایاں کا تذکار جلیلہ ایسے جلی حروف میں کیا جاتا ہے ——— چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما ——— بہرحال۔ یہ چیز تو یونہی ضمناً سامنے آگئی۔ اصل مقصود تو یہ ہے کہ اب عزم کو عمل میں لانے کے لئے کیا کیا جائے گا۔ جہاں تک ہماری نگاہ کام کرتی ہے، مجلس آئین ساز میں بہت کم ایسے حضرات دکھائی دیتے ہیں جن میں اسلامی خطوط پر آئین مرتب کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ مجلس سے باہر کے چند حضرات کو بطور معاونین ساتھ شامل کرلیا جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس باب میں نگہ انتخاب کن حضرات پر پڑتی ہے۔ اگر یہی کچھ کام کے آدمی ہوئے تو بھی کچھ توقعات وابستہ کی جاسکیں گی۔ ورنہ ——— کار طفلاں تمام خواہد شد۔

ہم جس حقیقت کو سو مرتبہ دہرا چکے ہیں اور ہزار مرتبہ دہرائیں گے وہ یہی ہے کہ اگر مسلمان فی الواقعہ چاہتے ہیں کہ ان کا آئین اسلامی خطوط پر متشکل ہو جائے تو اس کی ایک ہی شکل ہے کہ وہ اپنے آئین کا محور و مرکز قرآن کو قرار دیں اور اس کے بعد تاریخ وائرسے صرف انہی چیزوں کو بطور تائید و شہادت قبول کریں جن کی تائید قرآن سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس مجلس میں وہ حضرات شامل ہوں جنھوں نے قرآن کے تدبر میں اپنی عمریں صرف کی ہیں۔ اور وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بھی واقف ہیں۔

۲۔ مسعود رپورٹ

فروری کی اشاعت میں ہم نے سندھ ہاری رپورٹ کے سلسلہ میں مسٹر مسعود کی رپورٹ کا ذکر کیا تھا جسے حکومت سندھ نے صیغہ راز میں رکھا تھا۔ اس کے بعد سنا کہ سندھ کی نئی وزارت اس رپورٹ کو شائع کر دینے پر غور کر رہی ہے۔ بایں ہمہ وہ رپورٹ ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔ لیکن ہمارے پاس ایک مطبوعہ پمفلٹ پہنچا ہے جس کا نام ہے "اشتراکیت اور زرعی مساوات" اور جس کے مصنف ہیں "الحاج حضرت علامہ مولانا شاہ عبد الحامد صاحب قادری بدایونی"۔ اور جس میں "اشتراکیت کی مالی مساوات اور مسٹر مسعود آئی سی ایس کے دلائل پر بحث کی گئی ہے"۔ پمفلٹ میں سب سے پہلے بہت سے مولانا حضرات کا ایک فتویٰ ہے جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے "ہم نے مسٹر مسعود۔ آئی سی ایس کی رپورٹ کے اس حصہ کو جس میں انھوں نے قرآن کریم اور احادیث نبویہ اور فقہا اور علماء کے اقوال سے غلط استدلال کیا ہے، بغور مطالعہ کیا"۔ پھر حضرت مولانا سیفی ندوی کا ایک تعارفی مقدمہ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "آج سے تقریباً پانچ ماہ قبل میں نے ایک طویل اخباری بیان میں حکومت سندھ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ہاری کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ مسعود صاحب کی تنقیحات بھی شائع کرے۔ اس کے بعد وہ رپورٹ میں نے دیکھی"۔ اس کے بعد خود مصنف کے یہ الفاظ آتے ہیں کہ "میرے پاس بعض حضرات نے مسٹر مسعود آئی سی ایس کی مرتب کردہ رپورٹ کا وہ اردو ترجمہ جس میں مسعود صاحب نے بالشویک تحریک کو قرآن کریم اور احادیث نبویہ و فقہی احکام سے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے بھیجا ہے"۔ یہ پمفلٹ ہمارے پاس ایسے وقت میں پہنچا ہے کہ لمعات کے علاوہ رسالہ مرتب ہو کر پریس میں جا چکا ہے۔ اس لئے اس اشاعت میں پمفلٹ کے مشمولات پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اس وقت ہم جناب مصنف اور حکومت سندھ سے ایک اہم سوال دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ جناب مصنف سے یہ کہ جب انھیں معلوم تھا کہ یہ رپورٹ حکومت نے صیغہ راز میں رکھی ہوئی ہے تو جس شخص نے اس رپورٹ کو ان کے پاس بھیجا تھا اس نے یا سرقہ کیا تھا یا خیانت مجرمانہ کا ارتکاب۔ کیا جناب مصنف یہ ارشاد فرمائیں گے کہ اس طریق سے آئی ہوئی چیز سے استفادہ کرنا اخلاقاً۔ عرفاً۔ قانوناً۔ شرعاً کسی طور پر بھی جائز ہو سکتا ہے؟ پھر ہم یہی سوال ان تمام مفتیان کرام سے کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اس رپورٹ پر مسٹر مسعود کے خلاف فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

(بقیہ لمعات صفحہ ۹۶ پر ملاحظہ فرمائیے)

رفتارِ عالم

دہلی کانفرنس فروری کے اواخر میں جبکہ پاکستان کی فضا پاکستان مسلم لیگ کونسل، عالمگیر اسلامی کانفرنس اور کُل پاکستان خواتین کانفرنس کے ہنگاموں سے مرتعش تھی، ۲۶ فروری کو دہلی میں ہندوستان و پاکستان کے مہاجرین کو اپنے آبائی گھروں میں پھر سے آباد کرنے کے وسائل پر غور کرنے کے لئے ایک "غیر سرکاری" کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کی تحریک کس نے کی، اس کا جواب دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اس قدر بتایا گیا ہے کہ اسے ہندوستان کے اربابِ حکومت اور کانگریس کے ذمہ دار قائدین کی اشیر باد حاصل تھی۔ اس کی صدارت مجلس احرار کے صدر حبیب الرحمن لدھیانوی نے کی۔ اس کانفرنس میں تین سو مندوبین نے شرکت کی اور کہا جاتا ہے کہ ان میں پندرہ پاکستانی تھے۔ کانفرنس نے ہندوستان و پاکستان میں خیر سگالی کے مشن بھیجنے اور بین المملکتی کانفرنسیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کوائف کی روشنی میں اس "غیر سرکاری" کانفرنس کی نوعیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ایک پاکستانی "نمائندہ" حاجی محمد خاں نے اپنے جذبات خیر سگالی کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ پاکستان کا آئین پورے طور پر غیر دینی نوعیت کا ہے۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار بیشتر ازیں پاکستانی ہائی کمشنر متعینہ ہندوستان بھی کر چکے ہیں۔ ہائی کمشنر کو مشرقی پنجاب کے وزیر اعظم کے اس اعلان کا بھی یقین آچکا ہے کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں اور وہ اب آزادانہ پھر سکتے ہیں۔ دہلی کی اس کانفرنس میں پاکستان کے وزیر موصلات کا بھی پیغام سنایا گیا جس کی ابھی تک مستند طور پر تردید نہیں کی گئی۔ ہندوستان کی یہ شر انگیز تحریک اپنے مقاصد میں ناکام نہیں رہی۔

ہندوستان کا خلفشار ۱۵ گذشتہ میں ہندوستان کا اندرونی خلفشار نمایاں تر ہوا۔ اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے جو مہاراجہ پٹیالہ اور اودھم سنگھ ناگوکے گروہوں کی مؤثر مخالفت سے اپنا سابقہ وقار کھو بیٹھا ہے، پھر سے مرکزِ توجہ بننے کیلئے قانون کی خلاف ورزی کی جس پر اسے گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ اکالیوں کی طرف سے ۲ مارچ کو اس گرفتاری کے خلاف یوم احتجاج منایا گیا۔ اس روز انھوں نے مختلف مقامات پر مظاہرے کئے۔ حکام سے ان کا تصادم بھی ہوا لیکن سکھ اس قدر بٹ چکے ہیں کہ اکالی تحریک ان کیلئے بہت زیادہ پریشان کن نہ بن سکی۔ اس سے زیادہ حکومتِ ہندوستان کو کمیونسٹوں نے پریشان کیا۔ ۲۶ فروری کو کمیونسٹوں نے دم دم ہوائی اڈہ پر مسلح حملہ کیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے کلکتہ کے ٹیلیفونی نظام کو تباہ کر دینے کی ایک حد تک کامیاب کوشش ہو چکی ہے۔ کمیونسٹوں نے ہندوستان بھر میں ہڑتال کرانی چاہی۔ چنانچہ حکومت نے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں۔ ایک سرکاری اندازے کے مطابق سات ہزار کے قریب کمیونسٹ گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ وزیر اعظم ہندوستان نے ۲۰ فروری کو پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے بتایا کہ بڑی تعداد میں کمیونسٹ "زیر زمین" (underground) چلے گئے ہیں۔ انھوں نے

یہ بھی کہا کہ گذشتہ سال میں کمیونسٹوں نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ صرف معاندانہ ہی نہیں بلکہ کھلم کھلا بغاوت کے مترادف ہے۔

کمیونزم کی یلغار چین اور برما میں کمیونسٹوں کی فاتحانہ یلغاروں کے پیشِ نظر یہ سمجھ لینا غلطی ہوگی کہ ہندوستان نے کمیونسٹ خطرہ کو ٹال دیا ہے۔ ملایا میں سرخ خطرہ حکومت کے لئے کافی دردِ سر کا موجب بن رہا ہے۔ ۲۶ فروری کو سیام میں بھی زبردست تصادم ہوا۔ وہاں کی حکومت کا تختہ الٹنے کی منظم سازش کی گئی تھی۔ اس کے بعد وہاں بظاہر سکون ہے لیکن یہ سکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ہند چینی کے حالات میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ انام اور ٹانکن پر مشتمل ریاست ویٹ نام میں کمیونسٹ لیڈر ہوچی من کی قیادت میں جو جنگِ آزادی فرانس کے خلاف لڑی جا رہی ہے اس سے پہلوتہی کرتے ہوئے حکومت فرانس گذشتہ ڈیڑھ سال سے سابق شاہ انام باؤدائی کو واپس لانے کی خاطر گفت و شنید کر رہی تھی۔ باؤدائی اب تک ہانگ کانگ میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہا تھا۔ ۸ مارچ کو حکومت فرانس اور باؤدائی میں معاہدہ ہوگیا ہے جس کے مطابق سابق شاہ اپریل میں ہند چینی میں صاحبِ حکومت ہو کر داخل ہوگا۔ لازمی طور پر ویٹ نام کے حریت خواہ اس کٹھ پتلی حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ فرانس کی نیشنل اسمبلی میں ۱۱ مارچ کو اس موضوع پر بحث کے دوران میں کمیونسٹ ارکان نے مطالبہ کیا کہ ہوچی من سے پھر مذاکرات شروع کئے جائیں۔ شاہ باؤدائی کے لئے ہند چینی پھولوں کی سیج نہیں ہوگا۔

پاکستان میں بے چینی پاکستان کو ابھی تک کمیونسٹ یلغار کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن شمارہ گذشتہ میں پاکستان کی بالعموم اور مشرقی پاکستان کی بالخصوص جو حالت بتائی گئی تھی وہ ابھی تک اصلاح پذیر نہیں ہو سکی۔ مشرقی پاکستان کی ریلوں میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے جس سے تجارت اور خوراک اور کپڑے کی نقل و حرکت پر برا اثر پڑا ہے۔ گندم، چاول اور نمک کی قیمتیں بدستور چڑھ رہی ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ادنیٰ درجہ کے ملازمین ہڑتال کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں جس سے یونیورسٹی غیر معین عرصہ کے لئے بند کر دی گئی ہے۔ اس اندرونی بے چینی اور اضطراب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا علاج صرف قرآنی نظامِ معاشی ہی کر سکے گا جسے بہت جلد نافذ کرنا چاہئے۔

صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہونے والی ریاستوں میں استبداد پورے طور پر کارفرما ہے۔ سرحد کا دشمن پاکستان عنصر جو کچھ عرصہ مصلحت کے پردوں میں چھپا رہا، پھر نمودار ہوا ہے۔ ۵ مارچ کو خیبر ایجنسی کے چھ سو آدمیوں نے ٹوچی میں تھل قلعہ پر حملہ کیا۔ ٹوچی سکاؤٹوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ اس تصادم میں، سرکاری اندازے کے مطابق، پچاس آدمی مارے گئے۔ جاں بحق میں سرحد میں ایک اور سازش کا انکشاف ہوا ہے۔ ایک "اجنبی حکومت" اور کسی "پنڈت صاحب" کے سرمایہ سے اور برانگیخت پر سرخپوش جنگِ کشمیر کو پاکستان کے لئے ناکام بنانے اور وزیر اعظم سرحد کو قتل کر دینے کی کوشش میں رہے۔ ہر چند حکومت سرحد کے اعلامیہ میں حکومت ہندوستان کا ذکر نہیں تاہم ہندوستان نے حکومت پاکستان کو احتجاجی مراسلہ بھیجا اور سرخپوشوں سے اظہارِ ہمدردی کیا، حکومت پاکستان نے اس کے جواب میں ہندوستانی رویہ کی مذمت کی کہ اس سے سرخپوشوں کو شہ ملنے کا احتمال ہے۔ نیز ہندوستان کو پاکستان کے اندرونی معاملات

میں دخل دینے کا حق نہیں۔

سرحد کے حکمراں طبقہ کو پہلی بار ایک زبردست دھکا لگا ہے۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے سات زمیندار و جاگیردار ارکان حزب مخالف میں چلے گئے ہیں۔ وزیر اعظم عبدالقیوم خاں مزارعین سرحد کی جواشک شوئی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس میں ان ارکان کو کمیونزم اور مخالفتِ اسلام کی بو آتی ہے اور اپنی جاگیروں کے تحفظ کے "اسلامی" حق کو استعمال کرنے کی خاطر الگ ہو گئے ہیں۔ پیرپائی شریف کی غیر پارلیمانی مخالفت متوازی جماعت کی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔

پنجاب و سندھ پنجاب و سندھ جنگِ قیادت کے شکار ہیں۔ ۲۴ فروری کو سندھ کے سابق وزیر اعظم مسٹر کھوڑو کو تصرفِ بیجا اور مالِ مسروقہ اپنے قبضہ میں رکھنے کے الزام میں دو سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ یہ الزام ان الزامات سے الگ ہے جن کی تحقیقات کی تکمیل چار ماہ سے ہو چکی ہے۔ اس کے نتیجہ میں مسٹر کھوڑو کو تین سال تک "پبلک لائف" سے محروم کر دیا گیا ہے۔ پنجاب میں اب تک دو افسر معطل کئے جا چکے ہیں جن کے خلاف تحقیقات جاری ہے۔ چند ایک چھوٹے اور بڑے ڈپٹی کمشنروں کو معزول کر دیا گیا ہے۔ بیس "ہنگامی" مجسٹریٹ بھی معزول کئے جا چکے ہیں۔ محکمہ رابطۂ عوام جس پر نو لاکھ روپیہ سالانہ خرچ آتا تھا، توڑ دیا گیا ہے۔ ان اقدامات کے علاوہ صوبے میں اجناس کی ارزانی نے عوام کے حوصلوں کو پھر بلند کر دیا ہے۔ راشن میں ملنے والی اجناس کھلے بازاروں میں کنٹرول کے نرخوں سے کم قیمت پر دستیاب ہو رہی ہیں۔ صوبے کے اربابِ سیاست ہنگامۂ انتخاب کے لئے لنگر لنگوٹ کس رہے ہیں۔ لیگ کے مردہ گھوڑے کو چابک مارے جا رہے ہیں۔ پاکستان لیگ کے صدر افراد کے گناہوں کا اعتراف کرنے کے باوجود لیگ کے خلاف موجودہ عام بداعتمادی کے لئے پولیس کو مطعون کر رہے ہیں۔ وہ آئندہ صوبائی انتخاب لیگ کے ٹکٹ پر لڑنا چاہتے ہیں تاکہ "جاگیردار اور مخصوص مفاد کے لوگ کامیاب نہ ہو سکیں"۔ لیگ عوام میں اپنا مقام کھو چکی ہے اور اگر لیگ امیدوار کے سر پر سرکار کا سایہ نہ ہوا تو اس کی کامیابی کے امکانات قریب قریب مفقود ہیں۔

بلوچستان قائداعظم نے بلوچستان کا سیاسی درجہ بلند کرنے کی جو طرح ڈالی تھی اسے اور آگے بڑھایا گیا ہے۔ گورنر جنرل کے بلوچستانی ایجنٹ کیلئے ایک مشاورتی کمیٹی کا اعلان کیا گیا ہے جو پندرہ ارکان پر مشتمل ہوگی اور جسے ہر سال گورنر جنرل نامزد کریں گے۔ انھیں میں سے تنخواہ دار مشیر مقرر کئے جائیں گے جو بعض شعبوں کا انصرام سنبھال سکیں گے۔ اس کے علاوہ ہر ضلع اور بڑے شہر کے لئے لوکل باڈیاں قائم کی جائیں گی۔ اس اعلان سے بلوچستان کی سیاسی فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے اور سیاسی پارٹیاں بننا شروع ہو گئی ہیں۔

استصوابِ کشمیر میں التوا ہنگامہ زار کشمیر میں ابھی تک التوائے جنگ کے حکم پر سختی سے عمل کیا جا رہا ہے لیکن ناظم استصواب کا معاملہ اب تک لاینحل رہا۔ کشمیر کمیشن نے اس منصب جلیلہ کے لئے جن ناموں کی فہرست پیش کی تھی انھیں پاکستان و ہندوستان دونوں نے ناقابلِ بخش سمجھا تھا

کیونکہ دونوں کے خیال میں ان میں سے کوئی بھی معطلہ بین الاقوامی شہرت کا مالک نہیں تھا۔ اس کے بعد سابق امریکی سفیر متعینہ روس، مسٹر ہیڈل سمتھ، کا نام تجویز ہوا۔ اسے دونوں ملکوں نے تسلیم کر لیا لیکن خود صاحب موصوف نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ بالآخر ایڈمرل نمٹز Nimitz کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے اعلان کیا ہے کہ حکومت پاکستان ناظم استصواب سے پورا تعاون کرے گی۔

کچھ روز سے ہندوستان کی طرف سے اس قسم کی حرکات ہو رہی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ پرامن جمہوری طریق پر شاید نہ ہو سکے۔ ۲۴ فروری کو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ جب تک آزاد کشمیر سے نکلے ہوئے پناہ گزینوں کو اپنے گھروں میں واپس نہیں کر دیا جائے گا اور جب تک ان کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جائے گا کشمیر میں کوئی استصواب نہیں ہوگا۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ ہندوستان اس کے متعلق کسی وقت بھی "غیر خیر خواہ" کہہ کر استصواب کے نتیجہ سے بچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آزاد علاقہ کے بعض مقامات تک پناہ گزینوں کو خوراک، کپڑا وغیرہ بھیجنے کے لئے ہندوستان نے پاکستان کو جو سہولتیں دی تھیں وہ واپس لے لی گئی ہیں۔ ہندوستان کو یہ اعتراض ہے کہ یہ چیزیں بطور پراپیگنڈا استعمال کی جا رہی ہیں لہٰذا ان کی تقسیم ہندوستانی حکام کے ذریعہ ہونی چاہئے۔

استصواب کے اختتام تک آزاد علاقہ کے انصرام کا مسئلہ بھی کمیشن کیلئے دردسر بنا ہوا ہے۔ ہندوستان آزاد کشمیر حکومت کو اس انصرام کے حق سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ اس حق کو کمیشن تسلیم کر چکا ہے۔ کمیشن کی ایک ذیلی مجلس اس امر کا تصفیہ کرنے کیلئے آزاد علاقہ کا دورہ کر رہی ہے۔ اس ذیلی مجلس کی سفارش پر اس عقدہ کو سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔

پاکستان کا دوسرا میزانیہ

۲۸ فروری کو پاکستانی پارلیمان میں آزاد پاکستان کا دوسرا میزانیہ پیش کیا گیا جس کے اعداد و شمار اس امر پر شاہد ہیں کہ معاشی اعتبار سے پاکستان مضبوط بنیادوں پر ہے۔ اس میں بچت دکھائی گئی ہے۔ اس لحاظ سے آمد و خرچ کا یہ گوشوارہ خوش آئند ہے۔ لیکن آزاد اقوام میں آمد و خرچ کے حسابی اندازوں سے زیادہ اہم تعمیر ملت کے وہ پروگرام ہوتے ہیں جو دفاع کے بعد سب سے زیادہ قابل توجہ ہوتے ہیں۔ پاکستان پارلیمان کے ایک رکن کے الفاظ میں ہمیں وزارت خزانہ کیلئے کسی قابل محاسب (اکاؤنٹنٹ) کی بجائے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو پرانی روش سے ہٹ کر وقتی تقاضوں کے مطابق نئی پالیسی سوچ سکے اور اس پالیسی کو نافذ بھی کر سکے۔

صوبوں کو ختم کرنے کی تحریک

پاکستان پارلیمان کے اسی اجلاس میں ملک فیروز خاں نون نے پاکستانی صوبوں کو ختم کر کے مغربی پاکستان کو ایک انصرامی وحدت بنا دینے کی وہ تجویز پیش کی جو طلوع اسلام قریباً ایک سال ہوئے پیش کر چکا ہے۔ صوبائی خود مختاری کے فریب سے اکتائے ہوئے عوام اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ سال کے حوادث نے انہیں اچھی طرح محسوس کرا دیا ہے کہ صوبائی عصبیت اور صوبائی مناقشات کو دور کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ موجودہ صوبوں کی ہستی ختم کر دی جائے۔ اس تجویز کی

سب سے زیادہ اور گرم جوشانہ تائید صوبہ سرحد سے ہوئی ہے۔ بلوچستان کی طرف سے بھی اسکی تائید ہوئی ہے لیکن سندھ کی اسکی مخالفت ہوئی ہے۔

دستور سازی کا قدم اول

۷ مارچ کو پاکستان کی مجلسِ دستور ساز نے استقلالِ پاکستان کے قریباً انیس ماہ بعد دستور سازی کی تمہید کی۔ اس روز وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے ایک قرارداد کی شکل میں پاکستان کے آئندہ دستورِ اساسی کے مقاصد کا مستند اور باضابطہ اعلان کیا اور اس کی وضاحت میں تقریر کی۔ خدا تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کرتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ پاکستان کے آئندہ آئین کی بنیاد قرآن و سنت پر رکھی جائیگی۔

اس قرارداد کی روشنی میں دستور پاکستان کے مبادیات طے کرنے کیلئے مجلس دستور ساز کے چوبیس ارکان پر مشتمل ایک مجلس کی تشکیل کی گئی ہے جو زیادہ سے زیادہ دس ایسے حضرات کو بھی اپنی مباحث میں شریک کر سکتی ہے جو مجلس دستور ساز کے ارکان نہیں ہیں۔

فلسطین

۲۴ فروری کو ۹ ماہ کی جنگ کے بعد مصر اور اسرائیل میں عارضی صلح کے سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ اس کے مطابق اسرائیل کو بیر شبیہ (دارالحکومت نجب) میں فوج رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ابتدا میں مصر نے اصرار کیا تھا کہ بیر شبیہ سے یہود افواج نکال لی جائیں۔ اسرائیل کو نجب کا بڑا حصہ دیدیا گیا ہے اور انھیں یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ وہ شرق اردن کے بالمقابل شرقی نجب میں فوجیں بھیج سکیں۔ اس معاہدہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس کا تعلق صرف فوجی امور سے ہے۔ فلسطین کی آئندہ سیاسی یا آئینی حیثیت پر یہ اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔ شرق اردن سے بھی عارضی صلح کے معاہدہ کی گفتگو ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شرق اردن نے یہود کے خلاف اور یہود نے شرق اردن کے خلاف متارکہ کی خلاف ورزی کا الزام لگایا ہے۔ شرق اردن کی امداد کے لئے مزید برطانوی فوج بحیرۂ قلزم کی بندرگاہ عقبہ میں بھیج دی گئی ہے۔ یہودیوں نے مجلس تحفظ میں مطالبہ کیا ہے کہ برطانیہ انھیں واپس بلالے اور اس کے مقابل میں اپنی فوجیں آگے بڑھا دی ہیں۔ لبنان اور اسرائیل کی گفتگو بھی معاہدہ میں منتج ہو گئی ہے۔ شام نے بھی گفتگو پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ اب صرف عراق باقی رہ گیا ہے۔ ادارۂ اقوام متحدہ نے جو تین ارکان پر مشتمل فلسطینی مصالحتی کمیشن مقرر کیا تھا اس نے مفتی اعظم فلسطین کو بھی دعوت دی ہے کہ وہ کمیشن کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کریں۔ یہودی حکومت نے اس کے خلاف احتجاج کیا ہے۔

۵ مارچ کو حفاظتی کونسل نے اس کی سفارش کر دی کہ اسرائیلی حکومت کو اقوام متحدہ کا رکن بنا دیا جائے۔ اب یہ مسئلہ مجلسِ اقوام کی جنرل اسمبلی میں پیش ہوگا جو اپریل میں منعقد ہو رہی ہے۔

انڈونیشیا

اقوام متحدہ کی مجلس تحفظ نے انڈونیشیا کے متعلق جو قرارداد منظور کی تھی اس کے متعلق ہالینڈ نے اعلان کیا کہ وہ اس (قرارداد) کو نہیں مان سکتا۔ "ہاں ہالینڈ مصفانہ حل کے لئے انتہائی کوشش کر رہا ہے"۔ ولندیزی نمائندہ نے ۳ مارچ کو مجلس کے صدر کو ایک مراسلہ کے ذریعہ یہ اطلاع دی کہ انڈونیشیا کی آزاد ریاستہائے متحدہ کی تشکیل کے بارے میں مجلس اور ہالینڈ میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف "طریق کار" کا ہے۔

ہالینڈ کی طرف سے جمہوریہ انڈونیشیا کے قائدین کو ایک گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے سرکاری طور پر دعوت دی گئی تھی جس کے جواب میں ۹ مارچ کو جمہوریہ کے صدر ڈاکٹر سکارنو نے کہا کہ جب تک جمہوریہ کی حکومت کو پرانے دارالحکومت جوگجکرتا میں بحال نہیں کر دیا جائے گا وہ گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے۔ ہالینڈ اس کڑی شرط کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔ ۱۱ مارچ کو ولندیزی نمائندہ نے مجلسِ تحفظ کو بتایا کہ انڈونیشی جمہوریہ کی حکومت کو بحال کرنے کی جو کوشش کی گئی اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ ولندیزی دوسرے عذروں کے علاوہ کمیونسٹ ہوّا کو بھی اپنے طرزِ عمل کے جواز میں پیش کر رہے ہیں۔ سرکاری ولندیزی اعلان کے مطابق جاوا میں فوجی کارروائی تیز تر کر دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انڈونیشی گوریلا دستے بھی زیادہ سرگرم ہو گئے ہیں کئی مقامات سے سخت تصادم کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔

معاہدۂ اوقیانوس

مشرق و مغرب کی گروہ بندی میں ۸ مارچ کو ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ سات مغربی ممالک، برطانیہ، امریکہ، فرانس، بلجیم، کینیڈا، لکسمبرگ اور ہالینڈ نے یورپ اور شمالی امریکہ کے خلاف جارحانہ کارروائی کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک "معاہدہ اوقیانوس" کا اعلان کیا جس کے مطابق حملہ کی صورت میں ہر رکن ملک دوسرے رکن ملک کی فوجی امداد کریگا۔ اس معاہدہ میں شریک ہونے کے لئے پانچ اور ممالک ناروے، ڈنمارک، آئس لینڈ، پرتگال اور اٹلی کو بھی دعوت دی گئی ہے۔ اس بیس سالہ معاہدہ پر ۴ اپریل کو واشنگٹن میں دستخط ہوں گے۔ لازمی طور پر روس اس معاہدہ کو اپنے خلاف جارحانہ عزائم کا آئینہ دار سمجھے گا۔ اس کی پیش بندی سے روس غافل نہیں ہے۔ اس کی طرف سے ناروے اور ڈنمارک کو پیش کش کی گئی تھی کہ وہ معاہدہ اوقیانوس میں شریک ہونے کی بجائے روس کے ساتھ معاہدہ کر لیں۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ دونوں ممالک اپنی قسمت مغربی ممالک سے وابستہ کریں گے۔ فن لینڈ ابھی تک تیسری جنگ سے کنارہ کش رہنے کا عزم رکھتا ہے، سویڈن بھی غیر جارحانہ روش کا متمنی ہے۔ چین میں کمیونسٹوں کی فتوحات سے روس اپنا مشرقی محاذ محفوظ سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایک اطلاع کے مطابق اس نے سائبیریا سے اپنی افواج کی دس سے سترہ ڈویژنیں مغربی روس کو منتقل کر لی ہیں۔ روس مشرق بعید میں اب اپنی پوزیشن غیر محفوظ نہیں سمجھتا۔

مشرق و مغرب کے اس تحزب کے دوران میں مغربی ممالک کے کمیونسٹوں نے واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ روس کے خلاف جنگ کی صورت میں وہ روس کی امداد کریں گے۔

مؤتمر وزرائے اعظم دولت مشترکہ

کچھ عرصہ سے دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی ایک اور مؤتمر سے متعلق پیشگوئیاں ہو رہی تھیں۔ بالآخر اس مؤتمر کے انعقاد کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اپریل میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم لندن میں جمع ہوں گے۔ وزرائے اعظم کی پہلی مؤتمر گذشتہ اکتوبر میں لندن میں منعقد ہوئی تھی۔ حال ہی میں برطانیہ کے چار وزیر اور نمائندے دولت مشترکہ کے ممالک میں چکر لگا رہے تھے تاکہ ایک دوسری مؤتمر کے لئے فضا سازگار کریں۔ ان میں کا ایک نمائندہ ہندوستان بھی آیا۔ اس زمانہ میں آسٹریلیا کا ڈاکٹر ایوٹ اور ایک سیلونی نمائندہ بھی ہندوستان میں موجود تھے۔ پنڈت نہرو نے لگے ہاتھوں برما سے متعلق ایک

غیر رسمی کانفرنس کروائی۔ حکومت ہند نے اس کانفرنس کے انعقاد اور اس کے شرکاء سے متعلق پاکستان کو اطلاع تک نہیں دی۔ پاکستان والے ایسی کانفرنس کو بے کار سمجھا جو برائے متعلق ہو لیکن اس میں ہر ایک کا کوئی نمائندہ شریک نہ ہو۔ خود برمی حلقوں میں اس اقدام کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ہندوستان پر استعمار دوستی کا الزام لگایا گیا۔

مالوٹوف کی سبکدوشی

وزارت خارجہ سے موسیو مالوٹوف کی سبکدوشی ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ مختلف ممالک سے اس کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں ہوئی ہیں۔ بعض اسے مولوٹوف کی معزولی قرار دیتے ہیں اور بعض اسے سٹالین کی جانشینی تک کے مرادف سمجھ رہے ہیں۔ بظاہر مالوٹوف کی معزولی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتے۔ وہ بدستور اول نائب وزیر اعظم اور مجلس وزراء کا صدر ہے۔ نیز وہ Polit-Bureau کا رکن ہے۔ قرین قیاس ہے کہ اعلیٰ عزائم و مقاصد میں سٹالین کو مولوٹوف کی زیادہ ضرورت ہے۔ اسی لئے اسے وزارت خارجہ کے بار سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ اگر حقیقت یہی ہے تو مشرق و مغرب کی کشمکش میں روس کی حکمت عملی میں کوئی نرمی اور مفاہمت پیدا ہونے کے احتمالات کالعدم سمجھنے چاہئیں۔

ہوس قیادت عالم اسلامی

چودھری خلیق الزماں پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو کر اب عالم اسلامی کی قیادت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ نام نہاد انتخاب کے بعد آپ نے انگلستان جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تاکہ پرانے تعلقات کو تازہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ تبلیغ بھی فرما رہے ہیں کہ جب تک روئے زمین کے مسلمان ایک ہی نظام حکومت کے تحت نہیں آجاتے اسلامی حکومت کا قیام ایک خواب سے زیادہ وقیع نہیں ہوگا۔

معارف القرآن (جلد سوم)

معارف القرآن کی پیش نظر جلد کے متعلق جلد دوم کے مقدمہ میں تعارفی تذکرہ آچکا ہے اس لئے اس جلد کے لئے کسی تفصیلی مقدمہ کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس دوران میں بساطِ عالم پر ایک ایسا اہم واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے جس کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ یہ واقعہ ہے جنگِ یورپ کا اختتام۔ بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ اس قسم کے ہنگامی واقعات کو معارف القرآن کے مقدمہ سے کیا تعلق؟ لیکن جن کی نگاہیں واقعات و حوادث کی سطحیت سے ہٹ کر ان اسباب و علل تک پہنچتی ہیں جو ان نتائج و سوانح کے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ نہ تو یہ جنگ محض اتفاقی طور پر شعلہ بار ہوگئی تھی اور نہ ہی اس کے نتائج و عواقب ہنگامی ہیں۔ یہ جنگ اور اس کی تمام ہلاکت سامانیاں، فطری اور حتمی نتیجہ تھیں اس نظامِ تہذیب و تمدن کا جس کی تمام عمارت غیر فطری بنیادوں پر استوار ہے۔ اور اس کے نتائج و عواقب پیش خیمہ ہیں ان فساد انگیزیوں کا جو ہر نگہِ دور رس و فرداشناس کو چہرے کا شانۂ خوف و ہراس بنا رہی ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے متعلق Briffault نے کہا تھا۔

> یہ جنگ مع اپنے تمام بے پایاں مصائب کے جن کی وجہ سے آج ہمارا شعور گوناگوں وحشت انگیز پریشانیوں کا مسکن بن رہا ہے، کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ تمام مجرمانہ حماقتیں، تمام منافقتیں، تہمت تراشیاں اور دروغ بافیاں، یہ تمام سنگدلانہ حرکات، انسانی زندگی، قوت اور دولت کی یہ تمام بربادی اور دہشت انگیز تباہی۔ غرضیکہ یہ پورے کا پورا پاگل پن اور اس کا ایک ایک عنصر ہماری قبل از جنگ کی مغربی تہذیب کے اندر موجود تھا۔ جنگ در اصل ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مرئی اوتار یا مادی مظاہرہ تھا جن کی مسموم فضا میں ہم گھرے ہوئے تھے۔ جنگ نے صرف اتنا کیا کہ ان بھیانک چہروں سے نقاب الٹ دیا۔

(The Making of Humanity, P. 360.)

اگر یہ الفاظ گذشتہ جنگِ عظیم کے متعلق درست تھے تو حال کی عالمگیر جنگ کے متعلق درست تر ہیں۔ چونکہ معارف القرآن کی زیرِ نظر جلد امم سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف، ان کی نفسیاتی کیفیات و ماجریات، خلافِ فطرت انسانی نظام ہائے تمدن و معاشرت کی فتنہ خیزیوں اور ان کے خلافِ فطرت

کے مطابق اسلوبِ حیات کے انسانیت سوز نتائج پر مشتمل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم ان نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیتے جائیں جو آج فضائے عالم کو متحرک کرنے کا باعث ہیں اور یہ دیکھیں کہ اس تمام فتنہ و فساد کی علت کیا ہے؟ اور آیا یہ علت دورِ حاضرہ کی کسی وقتی غلط اندیشی کی پیدا کردہ ہے یا کوئی ایسی اصولی چیز ہے جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے اور آج بھی اسی طرح چلی جا رہی ہے؟ اور پھر اس کے بعد یہ دیکھیں کہ اس بنیادی خرابی کا جو علاج یورپ کی فکرگاہوں میں سوچا جا رہا ہے وہ حقیقی معنوں میں چارہ سازی کر سکتا ہے یا محض فریبِ قلب و نگاہ ہے۔ ان امور کا جائزہ لینے کے لئے ہم قیاسات و مفروضات سے کام نہیں لیں گے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ ان عالمگیر فساد انگیزیوں سے متاثر ہو کر خود مغرب کے اربابِ فکر و تدبر کس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔

یورپ کی ہولناک جنگ ختم ہو گئی اور سردست ان بھٹیوں کے منہ بند کر دیئے گئے جن کی شعلہ فشانیاں تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھیں۔ اب "بدمندانِ جہاں" اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں کہ کوئی ایسی تدبیر سوچی جائے جس سے ان بھٹیوں کے آتش بار دہانے پھر سے نہ کھلنے پائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن نظریاتِ زندگی کو غیر متبدل سمجھتے ہوئے اور (لہٰذا) ان پر قائم رہتے ہوئے یہ اربابِ سیاست و تمدن نظامِ عالم کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے لئے بیٹھے ہیں، ان نظریات کی موجودگی میں دنیا میں امن قائم بھی رہ سکتا ہے! فلسفۂ اجتماعیات کا عالم (William Brend) اپنی کتاب (Foundation of Human Conflicts کے مقدمہ میں (۱۹۴۴ء میں) لکھتا ہے۔

> اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوامِ یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہ الجھیں گی کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے۔ لیکن قومیت پرستی (Nationalism) کی روح یعنی وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے باقی رہے گا۔ اس لئے مستقبل میں جنگ (کے امکانات) کو ختم کرنے کے لئے آج کی سیاست دانی کی پرکھ اسی سے ہو گی کہ موجودہ جنگ کے بعد قومیت پرستی کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ خود مفکرینِ یورپ کے نزدیک اس انسانیت سوز فتنہ و فساد کا بنیادی سبب کیا ہے جس نے امنِ عالم کو اس طرح تباہ و برباد کر رکھا ہے؟ وہ نظامِ اجتماعی جس کی بنیاد قومیت پرستی پر ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ یہ تمام مدبرینِ عالم قومیتوں کے غیر فطری امتیازات اور ان امتیازات کے اغلال و سلاسل کو اس درجہ محکم رکھے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی نوعِ انسانی کے امن و فلاح کی تدابیر سوچ رہے ہیں! یعنی جسدِ انسانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے ہیں اور پھر اس جسم کی صحت و سلامتی کی فکر کی جا رہی ہے! یہ ہے وہ بنیادی نقص جو ان ہلاکت انگیزیوں کا ذمہ دار ہے اور جب تک یہ موجود ہے امنِ عالم کی کوشش کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ جب دلوں میں باہمی نفرت و رقابت کے جذبات آتشِ خاموش کی طرح سلگ رہے ہوں تو اصلاحی تدابیر کس طرح مستحسن نتائج پیدا کر سکتی ہیں! پروفیسر Pillsbury لکھتا ہے۔

قومیت کی تشکیل اور جامعیت میں سب سے موثر جذبہ نفرت کا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ قریب قریب تمام قومیں بڑی بڑی لڑائیوں یا دوسری قوموں سے طول و طویل مخاصمت کی پیدا کردہ ہیں۔

(Pillsbury; P. 83.)

اسی کی تائید میں تاریخ قومیت کا عالم Frederick Hertz اپنی کتاب Nationality in History and Politics; میں لکھتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے (اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک انگریز کے نزدیک کسی فرانسیسی، ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور تحقیر کا خیال پیدا کرتا ہے۔ لیکن خالی "انسان" کا لفظ اگر اس کا اطلاق صحیح طور پر کیا جائے، جذبۂ احترام پیدا کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔ (P. 328)

یعنی کسی انسان کا تعارف اگر اس کی قومیت کی نسبت سے کرایا جائے تو جذبۂ قومیت پرستی کا تقاضا ہے کہ دوسری قوم کے انسان کے دل میں اس کی طرف سے نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا ہوں۔ لیکن اس کی نسبت کسی قوم کی طرف نہ کی جائے اور وہ محض ایک انسان کی حیثیت سے سامنے آئے، تو اس کے لئے احترام و تکریم کے جذبات پیدا ہوں گے۔ یہ چیز اب کچھ اس طرح نکھر کر سامنے آرہی ہے کہ مفکرین یورپ میں سے جس کسی نے خالی الذہن ہو کر اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انسانوں کی اس غیر فطری (قومیتی) تقسیم نے نوعِ انسانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور جب تک انسان کے حریم قلب سے قومیت (Nationalism) اور وطنیت (Patriotism) کے ان مقدس بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے گا، یہ انسانیت کا کعبۂ مقصود نہیں بن سکے گا۔ Brend لکھتا ہے۔

آج ایک براعظم کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک زرخیز کھیت ہے جس میں انسانوں نے نہایت نامعقولیت سے دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ یعنی وادیوں کے اطراف و جوانب۔ سڑکیں، دریا وغیرہ جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے الگ کر رکھا ہے اور جذبۂ وطنیت وہ سیمنٹ ہے جو ان زندہ اینٹوں کو باہمدگر مربوط کئے ہوئے ہے جس سے انسان خود ساختہ جیل خانوں میں محبوس ہیں۔ (P. 57)

آگے چل کر یہی مورخ لکھتا ہے۔

وطنیت کا جذبہ اتحاد انسانی کے راستے میں سب سے بڑا پتھر ہے ...... انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں، یا تو یہ کہ وہ اپنی قومی فوقیت کو قائم رکھے اور اس طرح دنیا میں جنگ کا سلسلہ جاری رہے اور یا کسی قسم کے بین الاقوامی اتحاد کا راستہ اختیار کرے۔ (P. 75)

یہ یورپ کے مفکرین کی آواز ہے۔ امریکہ کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ لوگ اپنے نظامِ تمدن سے مطمئن ہیں اور انہیں مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ قلبی سکون و طمانیت بھی حاصل ہے۔ لیکن جب ان کا نظام بھی انہی عناصر پر مشتمل ہے جو نظامِ یورپ کی بنیادیں ہیں تو محض مقام کی تبدیلی سے نتائج میں اختلاف کس طرح ہو سکتا ہے؟ وہاں بھی یہی حالت ہے۔ امریکہ کا مشہور تہذیبی مورخ George. A. Dorsay اپنی کتاب Civilisation کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے۔

> میں خوش ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے۔ لیکن مجھے اس سے بھی زیادہ فخر ایک انسان ہونے پر ہے (اس لئے کہ) آج ہماری قومیت پرستی نوعِ انسانی کی بدترین دشمن اور تہذیب کے لئے شدید خطرہ ہے۔ (P. 958.)

پھر اگر قومیت پرستی کا یہ نظریہ اور وطنیت کا یہ جذبہ محض ایک ہنگامی حربے کے طریق پر استعمال کیا جاتا تو بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ کسی نہ کسی دن اسے خود بخود الگ کر دیا جائے گا۔ لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ یورپ نے اسے مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے اور ایک معبود کی صورت میں اس کی پرستش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیشنلزم آج مذہب کی رقیب و حریف کی حیثیت سے سامنے آتی ہے اور مذہب کے ساتھ تطبیق و توفیق میں اسے مشکل پیش آ رہی ہے۔ چنانچہ Hartz لکھتا ہے۔

> دورِ حاضرہ کی قومیت پرستی مذہب کے باب میں اپنے آپ کو عجیب الجھن میں پاتی ہے۔ ایک طرف اس کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے متبعین کے جذبۂ اطاعت و وفاکیشی کو خدا اور قوم کے درمیان بانٹنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ قوم کو ایک بت بناتی ہے اور قومیت پرستی کو خود مذہب کی حیثیت دیتی ہے۔ لیکن دوسری طرف نیشنلسٹ طبقہ میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ اپنی مذہب دشمنی کا اظہار کھلے بندوں کر سکے کیونکہ اس میلان سے بہت سے متبعین کے جذبات کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (P. 121)

اب غور فرمائیے کہ نیشنلزم کا وہ اصول جس سے وحدتِ انسانی کی جڑ کٹ جاتی ہے، جب کسی نظامِ تمدن میں مذہب کی حیثیت اختیار کر جائے تو اس نظام کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے؟ اگر بغور دیکھا جائے تو قومیت پرستی دراصل اس نظریۂ مادیت ... (Materialism) کا نتیجہ ہے جس میں خدا کا کلی انکار شرفِ انسانیت کی ہر شق کے انکار کو مستلزم ہوتا ہے۔ اس روشِ زندگی میں انسان نہ تو وحدتِ خلق کو بطور اصولِ حیات تسلیم کرتا ہے کیونکہ یہ چیز وحدتِ خالق کے ایمان سے پیدا ہوتی ہے، اور نہ ہی انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کو کسی محکم مرکز پر قائم کر سکتا ہے کیونکہ یہ خدا کے اقتدارِ اعلیٰ پر ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر زندگی کے اس طبیعی

---

¹ قرآن کی روشنی میں مسائلِ حیات سمجھنے والے نے کتنے عرصہ پہلے کہا تھا کہ

..... تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

چاردیواری تک محدود کردینے سے مکافاتِ عمل کا عالمگیر اصول، جو کائنات کی ہر شے کو محیط ہے، انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ حکومت اور سوسائٹی کے آئین و ضوابط کی پابندی بھی اسی حد تک کرتا ہے جس حد تک اسے پکڑے جانے کا خوف ہو۔ یہیں سے انسان کی داخلی اور خارجی زندگی میں کشمکش شروع ہوجاتی ہے جو منافقت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ یہ منافقت، موجودہ نظامِ تمدن کے ہر گوشے کو محیط ہے ــ Dorsey لکھتا ہے۔

(ہماری تباہی کا باعث) نہ تو وہ بڑے بڑے مجرم ہیں جن سے ہم لرزاں رہتے ہیں۔ اور نہ ہی ہمارا فلاسفی جس سے ہم نادم ہیں (اس کا اصل باعث) وہ معاشرتی نظام ہے جو منافقت اور فریب کی بنیادوں پر قائم ہے اور (اس کے ساتھ) یہ قانون کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ (P. 870.)

اور (Briffault) لکھتا ہے۔

. . . . ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی، ذہنی نظام کے ہر شعبہ میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔ (P. 360)

اس ریاکاری اور فریب دہی پر مبنی نظام کے قیام و ترویج کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انھوں نے زندگی کو سانس کی آمدورفت تک محدود کردیا ہے۔ مغرب نے عناصرِ فطرت کو یقیناً مسخر کرلیا ہے اس لئے کہ اس سے ان کی طبیعی زندگی میں خوش سامانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ لیکن ارتقائے انسانیت کے اصول کو نظر انداز کردینے یعنی بالفاظِ دیگر، قانونِ مکافاتِ عمل سے بیگانگی برت لینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسخر نہیں کرسکے۔ اور جب تک انسان اپنے آپ کو مسخر نہ کرلے، یعنی اپنے ہر ارادے اور خواہش کو "اقتدارِ اعلیٰ" (قوانینِ خداوندی) کے تابع نہ لے آئے۔ نظامِ عالم صحیح بنیادوں پر استوار نہیں ہوسکتا چنانچہ آج مفکرینِ یورپ خود اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں اور لوگوں کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جب تک تم اپنے آپ پر قابو پانا نہیں سیکھتے، مظاہرِ فطرت کی تسخیر کردہ قوتیں تمہاری ہلاکت اور بربادی کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ Brend اسی موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

یہ سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ انسان ابھی اس چیز سے بہت دور ہے کہ وہ یہ سیکھ لے کہ اپنے آپ پر حکومت کس طرح کی جاتی ہے۔ (اسی کا نتیجہ ہے کہ) وہ ہر جگہ پریشان اور غیر متیقن انداز سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ اس سوسائٹی کو متشکل کرنے کے لئے، جس کے لئے وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہے، ایک خاص راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا سطحی نگاہ اسے ہمیشہ دھوکا دیتی ہے۔ قدیمی اقتدار و عقائد ختم ہوچکے ہیں اور اس خلا کو کسی اور چیز نے پُر نہیں کیا۔ دنیا کے ایک معتدبہ حصہ پر تعمیری قوتوں کی بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے مختلف ... نمائندگی حکومتیں اور معاشرتی ادارے، اس باب میں ناکام رہ چکے ہیں کہ انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا جاسکے . . . . . انسان نے بڑے وسیع پیمانے پر علم حاصل کیا ہے

اور سائنس کے ہر شعبہ میں حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں اور فطرت کی قوتوں کے استعمال کی استعداد پیدا کرلی ہے۔ اگر وہ ان قوتوں کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتا تو کئی ایک معاشرتی خرابیوں سے آزاد ہوجاتا جو قدیم ایام میں ناگزیر سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ ہر وقت روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے لیکن فطرت کی ان قوتوں کو اپنی تخریب کے لئے استعمال کرتا ہے۔ (صفحہ ۳)

اس نظامِ تمدن کی تباہی اب اس درجہ بدیہی ہوچکی ہے کہ مغربی مفکرین اور باتوں میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھتے ہوں اس باب میں متفق اللسان ہیں۔ پروفیسر لاسکی (جس کی مادیت پرستی محتاجِ تعارف نہیں) لکھتا ہے کہ

جو تہذیب صرف مادی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہو وہ یقیناً تباہ ہو کر رہتی ہے جیسے کہ ہماری تہذیب تباہ ہو رہی ہے۔
(Roflections on the Revolution of the Time; P. 1.)

ڈاکٹر براڈ C. D. Broad نے (Mind and its place in Nature) کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا موضوع تاریخ تہذیب و تمدن سے بالکل مختلف ہے لیکن وہ اس کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

اگر میری اس تصنیف کے کچھ ورق اس تباہی سے بچ گئے جسے مغرب اپنے لئے اس انہماک سے تیار کر رہا ہے۔ تو وسطی افریقہ کی مستقبل کی یونیورسٹیوں کے حبشی نقاد شاید اسے ایک خوشگوار فریضہ سمجھیں کہ میرے ان اوراقِ پریشاں سے نظمِ فکر کی صورت پیدا کرلی جائے۔

اس تباہی کے متعلق (Brend) کے ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ "مختلف انداز کی حکومتیں اور معاشرتی ادارے اس باب میں ناکام رہ چکے ہیں کہ انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا جاسکے" یعنی انسان باایں ہمہ ادعائے علم و ترقی ہنوز درندگی اور سبعیت کی زندگی سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان کا کسی "اقتدارِ اعلیٰ" پر ایمان نہیں رہا۔ یہ وجہ کسی "فرسودہ خیال" "مذہب زدہ" ذہنیت کی تحقیق کا نتیجہ نہیں بلکہ خود مغرب ہی کے مفکرین اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔ چنانچہ Brend لکھتا ہے۔

انسان کی کوئی جماعت ہو، ایک فرد کو ایک محدود حلقہ کے اندر اور خاص شرائط کے ماتحت جذبات کی آزادی کی اجازت دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے جذبات کو اس محدود حلقہ سے باہر اور ان مخصوص شرائط کو توڑ کر بروئے کار لانے کی کوشش کرے تو وہ جماعت اس کی روک تھام کی تدبیر کرتی ہے۔ لیکن آج کوئی ایسا اقتدارِ اعلیٰ (Supreme Authority) نہیں جو اقوام پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد کرسکے۔ اس لئے اقوام کو اپنے جذبات کو بے زمام چھوڑنے کی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ آج انسانی اقوام کی حالت بالکل عہدِ طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو۔ (P. 4.)

یہ ہے اصل راز تمام فتنہ و فساد کا جس نے آج دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے یعنی کسی "اقتدارِ اعلیٰ" پر ایمان کا فقدان۔ جب دو آدمی ایک دوسرے سے لڑ پڑیں تو پولیس کا سپاہی ان پر گرفت کرتا ہے اور عدالت مجرم کو سزا دیتی ہے

لیکن غور کیجئے کہ جب دو یا زیادہ قومیں خونخوار بھیڑیوں[1] کی طرح آپس میں الجھ پڑیں تو وہ کونسی قوت ہے جو ان پر حوالہ فذ کرے اور مجرم کو سزا دے؟ اقوام عالم نے گذشتہ جنگ عظیم کے بعد "جمعیت اقوام" کی تشکیل کی جس سے یہ توقعات وابستہ کی گئیں کہ وہ امن عالم کے قیام کے لئے عدالت کا فریضہ سرانجام دیگی۔ لیکن اس "عدالت عالیہ" کا جو حشر ہوا وہ ہر شخص کے سامنے ہے۔ حتیٰ کہ آج یورپ کے مدبرین خود یہ کہنے پر مجبور ہو چکے ہیں کہ اس قسم کا کوئی ادارہ (جو اصطلاحی اور میکانکی اصولوں پر تشکیل کیا جائے) کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (Hertz اپنی کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے۔

اب یہ حقیقت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ کوئی بین الاقوامی ادارہ چل نہیں سکتا اگر اس میں صحیح روح کی کمی ہو۔

"صحیح روح کا فقدان" اس لئے کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، کوئی ایسا نظام تمدن یا اصول ہیئت اجتماعیہ جو انسانوں کو اقوام میں تقسیم کر دے، اور ان اقوام کا کسی "اقتدار اعلیٰ" پر ایمان نہ ہو، نوع انسانی کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ دنیا کے صحیح نظام کا راز "جمعیت آدم" میں مضمر ہے، جمعیت اقوام میں نہیں۔ اور جمعیت آدم کی تشکیل ممکن نہیں جب تک انسان ایک "اقتدار اعلیٰ" پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اس بلند مرکز سے وابستہ نہ کر لیں۔

انسانوں نے آج تک اجتماعی معاملات کے حل کے لئے مختلف اندازہائے حکومت وضع کئے اور وہ مختلف تجاریب کے بعد بالآخر نظام جمہوریت تک پہنچے ہیں جسے آج انسانی ہیئت اجتماعیہ کا بہترین نظام قرار دیا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ نظام بھی "اقتدار اعلیٰ" کے ایمان پر مبنی نہیں اس لئے فطرت انسانی کے صحیح تقاضوں کی تسکین اس سے بھی نہیں ہو سکتی۔ نظام جمہوریت کے متعلق مشہور اطالوی مدبر میزینی (Mazzini) نے لکھا ہے۔

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابل تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس کے نتائج کی حقیقت ایک سی رہتی ہے۔ خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں یا انقلاب (Revolution) اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے

---

[1] قوموں کی حالت آج ان درندوں کی طرح ہے جنہیں ایک پنجرے میں بند کر دیا جائے اور محافظ کوئی نہ ہو۔
(Spalding; Civilisation in East and West, P. 290.)

قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(Quoted by Griffith in Interpretters of Man, PP. 46-47)

یہ انیسویں صدی میں لکھا گیا تھا۔ اور آج (Rene Guenon) لکھتا ہے۔

اگر لفظ جمہوریت (Democracy) کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔ ... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ (کسی نہ کسی طرح) قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں، بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں۔ ... عام رائے دہندگی Universal Suffrage کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رو سے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(The Crisis of the Modern World, P. 106)

بیسویں صدی کے ان الفاظ پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے کہ انسانوں کا وضع کردہ قانون، خواہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو بہرحال استبداد کی طرف منتج ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کسی انسان کو کوئی حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ غور فرمائیے کہ یورپ اب چاروں طرف سے تنگ آ کر کس چیز کی تلاش میں ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یورپ اپنے نظام تمدن و حکومت سے اس درجہ تنگ آ چکا ہے اور اپنی ہلاکت کو حتمی اور یقینی طور پر سامنے دیکھ رہا ہے تو پھر وہ فطرت کے صحیح راستہ کو اختیار کیوں نہیں کر لیتا!

لہ ان الفاظ کو پڑھ کر یونہی آگے نہ بڑھ جائیے بلکہ غور کیجئے کہ دنیا کس طرح چاروں طرف سے خاسر و نامراد تھک تھکا کر قرآن کی طرف آ رہی ہے۔ غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ انسانی بلندیوں اور عظمتوں کے تمام عرش کس طرح بارگاہِ محمد عربی صلعم کے آستانِ قدس پر آ آ کر جھک رہے ہیں اور منفعل نگاہوں سے کہہ رہے ہیں کہ

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفو بندہ نواز میں

اس سوال کا جواب قرآن کریم کے اوراق پر شرح و بسط سے پھیلا ہوا ہے جہاں یہ واضح ہے کہ خلافِ فطرت نظامِ زندگی (جرائم) کے ماتحت قوموں کی قلبی اور دماغی کیفیات کیسی ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن اس مقام پر چونکہ ہم مغربی مفکرین کے افکار و آراء سے بحث کر رہے ہیں اس لئے اس سوال کے جواب کے لئے بھی انہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

Briffault نے اپنی کتاب میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ اقوامِ عالم کی تاریخ تمدن کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ

انسانی ترقی کی راہ میں دو چیزیں سنگ گراں بن کر حائل ہوتی ہیں ایک "فکر تقلیدی" Custom (Thought) اور دوسرا "فکر استیلائی" (Power-Thought)

اس کے نزدیک "فکر تقلیدی" سے مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی نئی بات سامنے آئے تو اسے یہ کہکر مسترد کر دیا جائے کہ چونکہ یہ مسلک اس روش کے خلاف ہے جو ہمارے آبا و اجداد سے متوارث چلا آ رہا ہے اس لئے ہم اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس کے بعد عقل و فکر کی تمام قوتیں اس باب میں صرف کر دی جائیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے ان کی وہی روشِ کہن انسب اور مبنی علی الحقیقت ہے۔ برفالٹ کی تحقیق کی رو سے انسانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑا اور پہلا سنگِ گراں یہی مسلک ہے۔ اور دوسرا فکر استیلائی۔ اس کی تشریح میں برفالٹ لکھتا ہے کہ آدمیت کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ ابتداءً انسان نے اپنی ذہنی استعداد کی رو سے ایسے ایسے اوزار و ہتھیار وضع کئے جن سے وہ حیوانات وغیرہ کو اپنے قبضہ میں لے آئے اور ان سے اپنی منشاء کے مطابق کام لے۔ لیکن جب اس کے دماغ نے کچھ اور ترقی کی تو جن انسانوں کو کچھ اچھے مواقع حاصل تھے، انھوں نے اب اس کی فکر کی کہ چرندے اور پرندے نہیں بلکہ خود انسانوں کو اپنے قابو میں لانا چاہیئے۔ یعنی انسان نے پہلے تو "کانٹا" وضع کیا جس سے مچھلی پکڑی جا سکے اور اس کے بعد ایسے "کانٹے" ایجاد کئے جن سے خود مچھلی پکڑنے والے ان کی گرفت میں آ جائیں اس سے تغلب و استبداد کی ابتداء ہوئی اور انسانوں نے دوسرے انسانوں پر حکومت کے انداز سیکھے۔ اس غلبہ و تسلط میں لذت ایسی تھی کہ یہ خون منہ سے لگا ہوا چھوٹتا ہی نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد عقل و فکر کی تمام قوتیں اس میں صرف ہونے لگیں کہ کس طرح ایسے جال تیار کئے جائیں کہ ان کے حلقوں میں پھنسا ہوا انسان کبھی نکلنے نہ پائے۔ اس کا نام برفالٹ کی اصطلاح میں فکرِ استیلائی ہے جو انسانی ترقی کی راہ میں دوسرا سنگِ گراں ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تباہی اور بربادی کو اپنی آنکھوں دیکھ لینے کے بعد بھی یورپ، صحیح روشِ زندگی کو اختیار کیوں نہیں کرتا؟

گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ یورپ کے اربابِ فکر و تدبر اپنے ہاتھوں سے مرتب کردہ نظامِ تہذیب و تمدن اور مسلکِ معاشرت و سیاست سے تنگ آ کر کس طرح ایک جدید

نظام کے فکر میں سرگرداں ہیں۔ ان کی فکری تحقیق کے نتائج کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) وہ نظام تمدن جس کی بنیادیں یکسر مادیت پر ہوں ہلاکت و بربادی کا موجب ہوتا ہے، فلاح و فوز اس کے نصیب میں نہیں ہو سکتی۔

(۲) جس نظام میں انسانوں کی تقسیم، گوشت اور خون، یا وطن اور زبان وغیرہ کے معیار سے کی جائے اور اس طرح نوعِ انسانی کو غیر فطری گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے وہ نظام انسانی ہیئت اجتماعیہ کے لئے بربادی اور تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ انسانیت کی بہبود کا راز احترامِ آدمیت میں ہے۔

(۳) انسانی ترقی کی راہ میں کورانہ تقلید اور تشنۂ حکومت سب سے بڑے پتھر ہیں۔ ان کی موجودگی میں کوئی قدم آگے نہیں اٹھ سکتا۔

(۴) کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہیں۔ یہ حق "اقتدارِ اعلیٰ" ہی کو حاصل ہے جسے خدا کہتے ہیں۔ اس کی محکومیت اس کے ضابطۂ قانون کی رو سے کی جاتی ہے جو فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن پر انسان اپنے نظامِ اجتماعی کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے اور اسے مطابقِ فطرت قرار دیتا ہے۔ انسانی فکر ان نتائج پر صدیوں کے ناکام تجارب اور مسلسل ٹھوکروں کے بعد پہنچی ہے اور وہ بھی واضح اور غیر مبہم انداز سے نہیں۔ اس کے بعد اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی ضابطۂ قوانین ایسا بھی ہے جس میں آج نہیں بلکہ آج سے چودہ سو سال پیشتر انہی اصولوں کو مطابقِ فطرتِ انسانی قرار دیا گیا تھا اور نوعِ انسانی کو پکار پکار کر کہا گیا تھا کہ تمہاری فلاح و سعادت صرف اسی نظامِ زندگی میں ہے جو ان اصولوں پر استوار ہوگا تو یہ سوچئے کہ اس ضابطۂ قوانین کا مقام کس قدر بلند ہوگا؟ کہہ دیا جا سکتا ہے کہ آج ہر مذہب پرست طبقہ کی یہی حالت ہے کہ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ تمام اصول ان کے ہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن سوال صرف اس دعوے کا نہیں بلکہ صرف دعوے کے ثبوت کا ہے۔ ہمارے پاس اس دعوے کا ثبوت ایسا بدیہی اور واضح ہے کہ اس میں کسی فلسفیانہ موشگافی اور سطحیانہ نکتہ آفرینی کو دخل نہیں۔ اس مقدمہ کو ختم کرنے کے بعد ورق الٹئے اور حضرات انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ کو دیکھئے۔ جو کچھ ہم نے اپنی طرف سے لکھا ہے اسے الگ رکھ کر خالص قرآنی آیات کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ ان میں جو اصول بیان ہوئے ہیں وہ وہی ہیں جن کی انسان کو تلاش ہے یا کوئی اور؟ آپ شروع سے آخر تک دیکھتے جائیے ہر مقام پر ایک ہی دعوت اور ایک ہی پکار نظر آئے گی اور وہ یہ کہ

(۱) حکومت صرف خدا کی جائز ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر تسلط کا حق حاصل نہیں۔

(۲) انسانی زندگی مادیت کی چار دیواری میں محصور نہیں بلکہ اس کی وسعتیں ان حدود سے کہیں آگے تک ہیں۔

(۳) وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق دینِ فطرت کے بنیادی اصول ہیں جس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ انسان بحیثیتِ انسان قابلِ احترام ہے۔ وجہِ شرف و مجد اس کی اپنی زندگی کے جوہر ہیں نہ کہ اضافی نسبتیں۔

(۴) قومیتوں کی تقسیم یکسر خلافِ فطرت ہے۔ اس سے وحدتِ انسانی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

(۵) انسان صرف دو گروہوں میں بٹ سکتے ہیں۔ حق کے طرفدار اور باطل کے حامی۔

اس دعوت کے خلاف ہمیشہ دو جماعتوں کی طرف سے مخالفت ہوتی رہی۔ ایک نے یہ کہہ کر اس کی تکذیب کی کہ یہ دعوت اس مسلک کے خلاف ہے جو ان کے آباؤ اجداد سے متوارث چلا آیا ہے اور دوسرے گروہ نے اس لئے مخالفت کی کہ اس سے ان کی سطوت و حکومت چھنتی تھی۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی انقلابی دعوت نے ان دونوں جماعتوں کا مقابلہ کیا اور اس حقیقت کا کھلے بندوں اعلان کیا کہ انسانیت کی بہبود کا راز انہی دو قوتوں کی تباہی میں مضمر ہے۔

آپ آئندہ اوراق میں حضرات انبیاء کرامؑ کے ان کوائفِ زندگی کا مطالعہ کیجئے جو قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں اور پھر دیکھئے کہ کیا ان کی دعوت یہی تھی یا کچھ اور؟ اگر آپ یہ دیکھ لیں کہ فی الواقعہ وہ تعلیم انہی اصولوں پر مبنی تھی جس کی طرف رفتہ رفتہ اب دنیا چلی آرہی ہے تو کیا اس سے پھر یہ لازم نہیں آتا کہ اس تعلیم کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور اس کا سرچشمہ ذہنِ انسانی سے ماوراء ہے! اس کو ایمان کہتے ہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس گذرے کہ یہ ضابطۂ تعلیم دنیا کے سامنے آیا۔ اس کے بعد اس میں ایک لفظ کا اضافہ یا رد و بدل نہیں ہوا۔ اس ساڑھے تیرہ سو برس میں عقلِ انسانی نے مختلف آئین و ضوابط وضع کئے اور ناکام تجارب کے بعد انہیں خود اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن اس تعمیر و تخریب کے مراحل میں فطرتِ انسانی نے جب اور جہاں کہیں امن و سلامتی کی راہ دیکھی تو وہ وہی راستہ تھا جو قرآن نے متعین کیا تھا۔ اس ساڑھے تیرہ سو برس میں قرآنی تعلیم کے مختلف گوشوں کا علی وجہ البصیرت تجربہ ہو چکا ہے۔ تو کیا یہ عین قرینِ عقل نہیں کہ جن گوشوں کو اس طرح آزمانے کا ابھی موقع نہیں آیا ان کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آئندہ تجربات ان کے متعلق بھی ثابت کر دیں گے کہ یہ بھی مبنی علی الحقیقت ہیں۔ اس چیز کو دوسروں کی سند سے مان لینا بھی خلافِ عقل نہیں۔ ڈاکٹر Broad لکھتا ہے۔

> ہم سب بہت سی باتوں کو دوسروں کی سند سے مانتے ہیں اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہماری یہ روش بڑی غیر معقول ہوگی۔ ہمیں صرف یہ دیکھ لینا ہوگا کہ کون سے معاملات (Cases) ایسے ہیں جن میں دوسروں کی سند سے مان لینا معقول ہے اور کون سے ایسے جن میں ایسا کرنا قرینِ عقل نہیں۔ (ص 484.)

جس تعلیم کے اتنے گوشوں کے متعلق زمانہ کے تجربات نے شہادت دیدی ہو کہ وہ عین مطابقِ فطرت ہے، اس کے باقی گوشوں کو مطابقِ فطرت تسلیم کر لینا "غیر معقول" نہیں کہلا سکتا۔ اس ایمان سے آپ آگے بڑھیں گے تو آپ کا علم اور عقل خود بتا دیگی کہ یہ ایمان حقیقت پر مبنی تھا۔ یہ ہے وہ طریقِ کار جس سے انسان بلا دلیل، دلائل و براہین کی آخری حد (درجۂ یقین) تک پہنچ جاتا ہے۔ پچھلے دنوں پروفیسر Andrade نے اپنی ایک براڈکاسٹ تقریر میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

سائنس بالیقین دلائل بہم پہنچاتی ہے۔ اور مذہب بلا دلیل یقین عطا کرتا ہے۔ (آئنسٹین مرقومہ ص ۴۴)

مغرب چونکہ یقین سے بہرہ یاب نہیں اس لئے وہ بایں ہمہ ادعائے حریت و آزادی، ان اغلال و سلاسل کو توڑ نہیں سکا جنہیں "عقل" نے وضع کئے اور جن میں وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر جکڑے چلا آتا ہے بقول Brend

> انسان آزادی کا مستحق ہے اور کئی ایک ملکوں میں اس نے تنگ آکر یہ سمجھنا بھی شروع کر دیا ہے کہ وہ آزاد ہے۔ یعنی وہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ ان قدیم اور جدید زنجیروں کو الگ پھینک دے جو اس کی خود ساختہ ہیں اور اسے بری طرح سے جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک ایسا معاشرتی ماحول پیدا کر رکھا ہے جسے وہ اپنے قبضہ Control میں نہیں رکھ سکتا۔ (اس لئے اسے توڑ نہیں سکتا) (P 3-4.)

فی الحقیقت مغرب کی تہذیب اس انداز سے دنیا پر چھا چکی ہے کہ ہر چند دنیا اس کے مہلک اثرات کو بچشم خویش محسوس کر رہی ہے لیکن اب اس کی گرفت سے نکلنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اور تو اور خود اہلِ مغرب اس چیخ و پکار کے باوجود اس کے پنجۂ آہنی سے رستگاری کی کوئی شکل نہیں دیکھتے۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔ اس لئے کہ وہ ذہنِ انسانی کے مرتب کردہ آئینِ تمدن کے نتائج و عواقب کا علاج خود ذہنِ انسانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ابدی حقائق کی روشنی میں اس کی اصلاح نہیں چاہتے۔ اس لئے ان کی کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ۔ رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر۔ یہ ابدی حقائق سرچشمۂ وحی سے مل سکتے ہیں جن کی عملی تشکیل حضرات انبیائے کرامؑ نے فرمائی۔ معارف القرآن میں اس مقدس طائفۂ جلیلہ کا تذکرۂ طیبہ اسی مقصد کے پیشِ نظر سامنے لایا گیا ہے۔

(۲)

کچھ عرصہ پہلے جب عیسائی مشنریوں کی طرف سے اسلام کے خلاف زہر افشانی زیادہ وسیع پیمانے پر کی جاتی تھی تو وہ قصصِ قرآنی کے متعلق اعتراض کیا کرتے تھے کہ ان کی تاریخی حیثیت قابلِ اعتماد نہیں۔ ان اعتراضات میں سے اکثر و بیشتر کا جواب خود اہلِ مغرب کی تاریخی تحقیقات اور اثری منکشفات نے دے دیا اور بقایا کے متعلق آئندہ کے انکشافات جواب بہم پہنچا دیں گے لیکن بایں ہمہ ایسے لوگ ابھی تک موجود ہیں جو ان مشنریوں کے اعتراضات کو نئے نئے انداز سے دہراتے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات کے متعلق متنِ کتاب میں ضمنی طور پر اجمالاً کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ معارف القرآن چونکہ تاریخی تنقید کی کتاب نہیں اس لئے اس میں تاریخی تحقیقات کی رو سے ان اعتراضات کا تفصیلی جواب نہیں دیا گیا۔ یہ ایک جداگانہ مبحث ہے جو زیرِ نظر کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ اگر توفیقِ ایزدی شاملِ حال رہی اور معارف القرآن کی تکمیل کے بعد زندگی نے مزید مہلت دی تو اس موضوع پر تفصیلی طور پر الگ لکھا جائے گا۔ واللّٰہ المستعان۔ سر دست ان معترضین سے صرف اس قدر کہنا ہوگا کہ ابھی تاریخی تحقیقات اپنے عہدِ طفولیت میں ہیں۔ نت نئے دن جدید انکشافات

خاک میں چھپی ہوئی صورتوں کو "لالہ وگل" کی شکل میں سامنے لا رہے ہیں۔ جس دن تاریخ نے یہ دعویٰ کیا کہ ازمنۂ گذشتہ کے ایک ایک واقعہ اور اس کی ایک ایک تفصیل کے متعلق یقینی طور پر سب کچھ معلوم کر لیا گیا ہے اس دن دیکھے گا کہ قرآن کا بیان کردہ کونسا واقعہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتماد نہیں قرار پاتا؟

چونکہ معارف القرآن کا موضوع تاریخی تنقید نہیں اس لئے اس میں انبیائے سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کے زمانہ کے متعلق بھی تاریخی تفصیلات سے بحث نہیں کی گئی۔ مثلاً ایک قیاس یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب سنہ ۲۲۰۰ ق م ہے۔ اور چونکہ حضرت یوسفؑ کے قریب چار سو سال بعد حضرت موسیٰؑ کی بعثت ہوئی، اس لئے حضرت موسیٰؑ کا زمانہ قریب سنہ ۱۶۰۰ ق م کا ہے۔ لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کا فرعون ریمیسس ثانی تھا جس کا عہدِ حکومت قریب سنہ ۱۲۰۰ ق م قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۱۹۰۰/۱۸۰۰ ق م کے قریب ہونا چاہیے (حتیٰ کہ بعض مورخین اسے سنہ ۱۶۰۰ ق م قرار دیتے ہیں) ....

معارف القرآن میں ان تاریخی قیاسات کے اختلاف سے بحث نہیں کی گئی اور عام طور پر ان تاریخوں کو لے لیا گیا ہے جس طرف قیاسات کا زیادہ جھکاؤ ہے۔ یہ چیزیں بہرحال ابھی تک قیاسات ہیں اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) معارف القرآن کے موضوع سے خارج۔ معارف القرآن میں ان قصص و وقائع کو اسی مقصد کے لئے پیش کیا گیا ہے جس مقصد کے لئے انہیں قرآن نے اپنے صفحات درج کیا ہے۔

(۳)

حلقۂ معارف القرآن میں سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ وہ "معجزات سے متعلق عنوان کا بڑی بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں اس لئے کہ قرآن کریم میں جن خارق عادت واقعات کا ذکر ہے انہیں عقل تسلیم نہیں کرتی اس لئے ان کی ایسی توجیہہ کی ضرورت ہے جن سے انہیں مافوق الفطرت نہ ماننا پڑے"۔ چونکہ مغرب کی عقل پرستی سے مرعوب ذہنیتوں کا رجحان عام طور پر اس طرف ہے اس لئے میں نے اس چیز کا تذکرہ یہاں ضروری سمجھا ہے۔ معجزات سے متعلق عنوان کو میں نے دانستہ آئندہ پر اٹھا رکھا ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے جہاں انبیائے سابقہ کے معجزات کا مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے وہاں اس حقیقت کو بھی بصراحت واضح کر دیا ہے کہ یہ سب ازمنۂ گذشتہ کے واقعات تھے۔ قرآن کریم کی دعوت چونکہ صرف اس زمانہ کے عربوں کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے اس لئے اس کا مدار حسی معجزات پر نہیں حضور خاتم النبیینؐ کا معجزہ قرآن ہے جو ایک ہنگامی واقعہ نہیں بلکہ ابدی معجزہ ہے۔ لہٰذا جب تک یہ دونوں چیزیں (یعنی انبیائے سابقہ کے معجزات اور قرآن کریم کا نبی اکرمؐ کے متعلق یہ اعلان) یکجا سامنے نہیں آئیں گی، حقیقت واضح نہیں ہوگی۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میرا مقصد قرآن کریم کو پیش کرنا ہے۔ کسی فرد، گروہ یا اپنے زمانہ کے عام رجحان کی رعایت سے قرآن کو کسی خاص قالب میں ڈھالنا نہیں۔ لہٰذا جو حضرات یہ توقعات وابستہ کئے ہوئے ہوں کہ معارف القرآن میں معجزات کے وقوع سے انکار کر کے

ایسی توجیہ بیان کی جائے گی جس سے انھیں مافوق الفطرت نہ ماننا پڑے، معارف القرآن کے مطالعہ کے بعد انھیں بھی اسی طرح مایوسی ہوگی جس طرح ان حضرات کو جو اعجوبہ پرستی کے شوق میں عام واقعات کو بھی خارق عادت (معجزات) قرار دیکر ان پر ایمان کا مطالبہ کرتے ہیں جنھیں ذہنِ انسانی نے تراشا اور جو بنی اسرائیل کے تتبع میں حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف منسوب کر دیئے گئے۔ اللہ کا احسان ہے کہ میں

نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

میں قرآن کے ساتھ چلتا ہوں اور اسی حد تک جاتا ہوں جہاں تک قرآن لیجائے۔ اس میں خواہ دورِ حاضرہ کے ذوقِ تجدد پسندی کو ٹھیس لگے یا قدامت پرست طبقہ کی غلط عقیدتمندی کو میں نہ ان کی خاطر قرآن کی حدسے ورے ہی رک جانا چاہتا ہوں اور نہ ان کی خاطر اس کی حد سے آگے بڑھنے کے لئے تیار ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ اس مقام پر میں اول الذکر طبقہ سے صرف اس قدر عرض کروں گا کہ معجزہ کا وجود کوئی ایسی چیز نہیں جس کے اقرار سے انسان کو "علم و عقل" کے بازار میں گھبرانا اور شرمانا پڑے۔ یہ صرف ہمارا جذبۂ مرعوبیت ہے جو ہم میں اس قسم کا احساس فروتری پیدا کر دیتا ہے۔ معجزہ کے خلاف جو اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ اعتراض اس زمانہ کی پیداوار ہے جب قوانینِ فطرت کے متعلق انسانی علم بالکل سطحی تھا، جوں جوں یہ علم وسیع اور گہرا ہوتا جاتا ہے، سابقہ نظریئے اور ان پر اعتراضات سائے کی طرح سمٹتے چلے جاتے ہیں..... Max Planck کا نام دنیائے طبیعیات میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ نظریۂ مقادیر۔ Quantam Theory کا موجد (Kaiser Wilhelm Society for the Advancement of Science) کا پریذیڈنٹ ہے جس سے بڑا اعزاز جرمنی کی طبیعیاتی اکاڈمی میں اور کوئی نہیں۔ یہ فاضل سائنسداں اپنی کتاب (The Universe in the Light of the Modern physics) میں قوانینِ فطرت کے متعلق لکھتا ہے۔

> ہمیں ایسا فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ کوئی خاص قوانینِ فطرت موجود ہیں یا یہ کہ اگر کوئی خاص قوانین اس وقت تک موجود تھے تو وہ آئندہ بھی اسی طرح رہیں گے۔ یہ بات بالکل سمجھ میں آنے والی ہے کہ کسی سہانی صبح فطرت کسی ایسے خلاف توقع واقعہ کو ظہور میں لے آئے جس سے ہم سب کے بکے رہ جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم بے بس ہوں گے کہ اس کے خلاف کوئی اعتراض کر سکیں خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ہم اپنی کوششوں کے باوجود اس انتشار میں کوئی نظم پیدا کر سکیں۔ ایسے حالات میں سائنس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے۔ (P. 58.)

اس وقت اس سرسری سے اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر ہو سکے گی۔

(۴)

کتاب کی ترتیب کے مطابق جلد زیرِ نظر کے آخر میں ایک نہایت اہم باب رکھا گیا تھا جس میں

تاریخی چھان بین کے بعد بتایا گیا ہے کہ تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی جمع و تدوین کس طرح عمل میں آئی۔ پھر وہ تحریف و الحاق کے کن کن مراحل سے گذریں اور نزولِ قرآن کے وقت ان کی کیفیت کیا تھی۔ اس تاریخی تحقیق اور ان کتابوں کے اندر جو تعلیم موجود ہے ان سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں خدائی تعلیم اس آسمان کے نیچے کہیں بھی اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی اس لئے ضروری تھا کہ پیغام خداوندی اپنی منزہ صورت میں دنیا کے سامنے آئے اور اسے پھر قیامت تک کیلئے محفوظ رکھا جائے۔ افسوس ہے کہ مذکورہ صدر دشواریوں کی وجہ سے یہ باب جلد زیرِ نظر میں شامل نہیں ہو سکا۔ اب اسے آئندہ جلد میں شامل کیا جائیگا۔ انشاءاللہ العزیز۔

لیکن مشکلات کے اس تذکرہ کو ناشکرگذاری پر محمول نہ کر لیا جائے جس نامساعد ماحول میں میں گھرا ہوا ہوں اس میں اتنا کچھ بھی محض اس مبدءِ فیض کی کرم گستری کا صدقہ ہے جس کے لئے میں قدم قدم پہ بارگاہِ صمدیت کے حضور سجدہ ریز ہوں۔

یہ تو قطع کردہ راستہ کے متعلق ہے لیکن مجھے اس کی عاجز نوازیوں کی اس سے بھی کہیں زیادہ احتیاج آئندہ جلد کی ترتیب کے سلسلہ میں ہے جو مشتمل ہوگی اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کے تذکرۂ قدسیہ کوائفِ طیبہ پر جو مدارجِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ اور معارجِ بشریت کی منتہائے اعلیٰ ہے۔ وہ پیامبرِ مبارک کہ کائنات کی جلوہ رعنائیاں جس کی ایک نگاہِ ارم آفریں پر نچھاور اور کونین کی تمام زیبائیاں جس کے ایک تبسم فردوس منظر پر تصدق ہونے کے لئے ہمہ تن انتظار تھیں۔ وہ داعیٔ انقلاب کہ جس نے نگاہ کے زاویوں کو اس طرح بدل دیا کہ دنیا کی ہر شے نے ایک نئی (اور مطابقِ فطرت) قدر حاصل کر لی۔ وہ زبدۂ کائنات کہ جس کے نقشِ قدم کے درخشندہ ذرات، ہر رہروِ منزلِ رشد و سعادت کے لئے انجمِ ہدایت و دلیلِ راہ ہیں۔ وہ حکیم اعلم الناسؐ کہ جس نے زندگی کے خواب کو ایسی حسین تعبیر عطا فرمائی جس سے خود زندگی مسکرا اٹھی اور اس کی مسکراہٹ سے کائنات پر شباب آگیا۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰؐ او را بہا ست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰؐ است

آئندہ جلد اسی ذاتِ گرامی (فدیتہ بابی و امی) کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل ہوگی۔ مجھے اپنے ہاتھ کی کوتاہی اور اس شاخِ طوبیٰ کی بلندی کا پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے جب میں اس مرحلۂ شوق کا تصور کرتا ہوں تو دل کی دھڑکن یہ کہکر عناں گیر ہو جاتی ہے کہ — چشم بربستۂ او کشا بازیچۂ لشتن نگر — لیکن اس کے ساتھ ہی کسی کا کرم بے حساب یہ کہکر جرأت آموز ہو جاتا ہے کہ اس کے بازارِ رحمت میں یہ بھی تو دیکھنے میں آیا ہے کہ۔

سطوتِ کوہ گراں تا بہ کاہے بخشند　　کلہِ جم بگدائے سرِ راہے بخشند

۲۷۔ ترکمان روڈ
نئی دہلی

پرویز
جولائی ۱۹۵۳ء

اس تعارف کے بعد اصل کتاب میں معمارِ حرم، حضرت خلیل اکبرؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک انبیاءِ کرامؑ کے قرآنی تذکرے مذکور ہیں۔ آخر میں ان سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے جس کی ابتدا ان سطور سے ہوتی ہے جو جلد چہارم کا اجمالی تعارف کراتی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق جو صبحِ ازل، جھلملاتے تاروں کی سکوت افزا شبنمی چھاؤں میں، جانبِ منزل روانہ ہوا تھا، قندیلِ آسمانی کی بصیرت افروز و جہاں تاب روشنی میں، زمزمہ سنج و نغمہ بار، جذب و کیف کی نورانی وادیاں طے کرتا اس مقام تک آ پہنچا جہاں سے چراغِ منزل، روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح، دور سے مسکراتا نظر آ رہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس مقصدِ عظیم کی تکمیل ہو گی جس کے لیے خاک کے ذرے مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکرِ آدم میں متشکل ہوئے اور یہ پیکرِ آب و گل، مقامِ شرف و مجدِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا۔ نفوسِ قدسیہ کا یہ قافلۂ رشد و ہدایت ایک جوئے رواں تھی جو دامنِ کہکشاں سے فراز کوہ پر جلوہ بار و گہر ریز ہوئی اور سینۂ کہسار کو چیرتی، بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی، سرودِ زندگی کو اپنی لہروں کے آغوش میں پرورش دیتی داخلِ دشت و صحرا ہوئی۔

در خوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب — واکرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او — سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ مستِ خرام جوئبار، دشت و صحرا میں زمینِ صالح کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس و خاشاک اور ہر کشتِ زیوں حاصل کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں بہاتی آگے بڑھتی گئی۔ گاہ اپنی سکوت افشاں روانیوں سے سبزۂ نوخیز کا منہ چومتی اور جھکی ہوئی شاخوں کو آئینہ دکھاتی اور گاہ، کفِ بردھاں طغیانوں سے بڑے بڑے سرکش و تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑتی۔ این و آں سے بے نیاز، ماحول سے مستغنی۔ گرد و پیش سے غیر متاثر، اپنی خودی میں مست۔ انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط سے بے رخی برتتے اور صرف اس قانونِ سرمدی کی اتباع کرتے جس کے تابع زندگی بسر کرنے کے لیے اس کی تخلیق ہوئی تھی جانبِ منزل بڑھتی چلی گئی۔

در ہائے پرخروش ز بند و شکن گذشت — از سنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را — از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار — در ہر زماں تبازہ رسید از کہن گذشت
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود — در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

ہاں! تو یہ قافلۂ تب و تاز۔ یہ کاروانِ نور و نکہت۔ ہر ناقۂ بے زمام کو دعوتِ قطار دیتا اور ہر رہرو سفرِ حیات کی تقدیروں کی پردہ کشائی کرتا اس مقام تک آ پہنچا جہاں آثارِ منزل نکھر کر سامنے آ گئے، تکمیلِ سفر

کی ہنگامہ خیز مسرت اور حصولِ منزل کی مسرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہم پا شکستہ کیا لگا سکتے ہیں۔ جن کے قدم آشنائے جادہ نہ آنکھیں شناسائے منزل؟ اس والہانہ کیفیت کو پوچھئے کسی ایسے قلب زندہ سے جس پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہو کہ

حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

بہرکیف، یہ راحلۂ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھئے! ہر فردِ کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریمِ کعبہ میں ہوگا۔ جب تک یہ کارواں تیاریوں میں مصروف ہے، آیئے ہم ان کی قطع کردہ راہوں پر ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالیں تاکہ گذری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور ہم ان شگفتہ و شاداب پھولوں کو دامنِ نگاہ میں لئے ان کے ساتھ آگے بڑھیں کہ اس سے آگے فاران کی مقدس وادی میں پہنچکر، جہاں کا ہر سنگریزہ جلوہ فروشِ صد طور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے۔ اس کی فرصت نہ مل سکے گی کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرفِ نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقفِ سجود ہوگی۔

جلد چہارم حضور سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والسلام کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل ہے جو قرآن کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ قرآنی سیرتِ رسولؐ ایک عجیب و غریب صحیفہ ہے۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات پر "ظہر الفساد" کے عنوان سے تمام دنیا کے مذاہب، آسمانی صحف اور تہذیب و تمدن کی تاریخ اور ظہورِ اسلام کے وقت ان کی حالت کا مبسوط تذکرہ ہے۔ اس مجموعۂ معلومات نے کتاب کی افادی حیثیت میں گراں بہا اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب قریب ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور پریس میں جانے کیلئے تیار۔ اللہ تعالیٰ محترم مؤلف (جناب پرویز) کو ان کی عمر بھر کی جگر کاوی اور دیدہ ریزی کا صلہ عطا فرمائے اور اس سلسلۂ سجوئے رواں کی تکمیل کی توفیق دے۔

یارب ایں دعائے من چہ خوش است

طلوعِ اسلام

مغضوب اسرائیلیوں کی ریاست

مسلمانوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ!

(حافظ نذیر احمدؒ صاحب - میو روڈ - محمد نگر - لاہور)

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان مسلمانوں نے اس قدر حیرت و استعجاب سے سُنا کہ ولایات متحدہ امریکہ کی طرف سے اس کی آئینی حیثیت تسلیم کر لینے پر بھی اکثر لوگ اس واقعہ کو ماننے اور نہ ماننے کی بابت تذبذب میں رہے۔

ریاستِ اسرائیل آئینی طور پر صحیح ہے یا غلط، اس مضمون میں اس سے بحث نہیں۔ اس لئے کہ اس کا قیام سراسر عدل و انصاف اور جمہوریت و دیانت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ریاستِ اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا۔ دنیا کی چھوٹی بڑی سب حکومتوں نے اسے تسلیم کیا۔ امریکہ اور روس جیسی دو بڑی حکومتوں سے اس کے سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔

ریاستِ اسرائیل کا قیام آیاتِ قرآنی کے خلاف ہے یا عالمِ اسلامی کے لئے ایک چیلنج؟ مضمون میں اس سوال پر غور کیا گیا ہے۔ بحث نظری نہیں بلکہ عملی ہے اور عملی دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے مقصدِ تحریر بحث و مباحثہ کے لئے ایک نیا میدان تیار کرنا نہیں بلکہ ایک غلط فکر کی تردید اور علم و عمل کے لئے احساس بیدار کرنا مقصود ہے۔ اس لئے کہ خوش فہمیوں میں مگن ہو کر اور واقعات کی دنیا سے آنکھیں بند کر کے محض امانی سے حقائق کو بدلا نہیں جا سکتا۔

۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو شام کے ۶ بجے اسلامی دنیا نے یہ اعلان بڑی حیرت و استعجاب سے سُنا کہ ارض مقدس میں ریاستِ اسرائیل قائم ہو گئی، اور اسرائیل کا صدیوں کا خواب پورا ہو گیا۔ ابھی مسلمان اس اعلان کی صداقت پر غور ہی کر رہے تھے کہ دو منٹ کے بعد دنیا کی تین بڑی سلطنتوں میں سے ایک یعنی جمہوریہ ولایات متحدہ امریکہ نے اعلان کر دیا کہ وہ ریاستِ اسرائیل کی آئینی حیثیت کو تسلیم کرتی ہے ــــ ڈیڑھ دن نہیں گذرے کہ چاروں طرف سے اس قسم کے سرکاری اعلانات ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۷ مئی کو سویڈن۔ نیوزی لینڈ۔ اور روس سے اور چند دن بعد پولینڈ یوگوسلیویا اور جنوبی افریقہ کی حکومتوں کی طرف سے اسی قسم کے اعلانات ہوئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو کینیڈا نے ریاستِ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ برٹش کامن ویلتھ کی یہ دوسری ممبر حکومت ہے جس نے یہ اقدام کیا ہے۔

اور تسلیم کرلینے والی حکومتوں میں یہ بیسویں حکومت ہے جس نے ریاستِ اسرائیل کی آئینی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔

تل ابیب ریاستِ اسرائیل کا دارالخلافہ ہے۔ جس کے معنی "بہار کی پہاڑی" ہیں، اور واقعی اسم بامسمیٰ ہے۔ باہر سے آکر بسنے والے یہود نے ۱۹۱۰ء میں اس کی بنیاد رکھی۔ اور تینتیس (۳۳) سال کے قلیل عرصہ میں آبادی ایک لاکھ پچاس ہزار (۱۵۰،۰۰۰) تک پہنچ گئی۔ فلسطین کا یہ سب سے جدید شہر ہر لحاظ سے مکمل اور کامل شہر ہے۔ جس میں مستقل نمائش گاہ، چڑیا گھر، اور عجائب گھر موجود ہیں۔ جابجا پارک، کھیلوں کے میدان اور تفریح خانے موجود ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں اس یہودی شہر کے اندر چھ سینما گھر، اسی پریس، بارہ اخبار اور ایکسو بیس تعلیمی ادارے تھے۔

ریاست اسرائیل کا اپنا ریڈیو سٹیشن ہے۔ تین بندرگاہیں اور ہوائی جہازوں کے متعدد مستقر ہیں۔ بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، روس اور امریکہ کی حکومتیں جائز اور ناجائز طور پر ظاہر اور پوشیدہ اسلحہ سے اس کی امداد کر رہی ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو یعنی تین ماہ کے بعد ہی ریاستِ اسرائیل نے اپنا سکہ جاری کر دیا۔ دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کر لئے حتیٰ کہ ستمبر کے آغاز میں روس اور امریکہ سے سفارتی تعلقات بھی پیدا کر لئے۔

ریاستِ اسرائیل کی کونسل کے صدر اعلیٰ ڈاکٹر وائزمین مشہور سائنسدان ہیں۔ جنگِ عظیم اور گذشتہ جنگِ عالمگیر میں ان کی ایجادات سے اتحادیوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور ان کے صلہ میں یہود کو عربوں کا گھر "قومی وطن" کے طور پر پیش کیا گیا۔ اسی کو کہتے ہیں "حلوائی کی دکان پر دادا کی فاتحہ"۔ ڈیوڈ بن گورین وزیر اعظم ہے اور موشے شرتوک وزیر خارجہ۔ بارہ وزیر ان کے علاوہ ہیں۔ گو یہ تمام ارکانِ سلطنت غیر ملکی نوآبادکار یہودی ہیں، لیکن دنیا کی بیس حکومتیں ان کی خود ساختہ ریاست کو تسلیم کر چکی ہیں۔ اور وہ نہایت استقلال و پامردی سے اپنا کام چلا رہے ہیں۔

ریاست اسرائیل جنگی اخراجات پورا کرنے کے لئے پچاس ہزار پونڈ سالانہ کی آمد پر پچھتر فی صدی ٹیکس وصول کر رہی ہے۔ اور مال کے پیچھے جان دینے والے "مغضوب اسرائیلی" بخوشی ادا کر رہے ہیں۔ ابھی نومبر میں ۱۳ اور ۱۴ لاکھ پونڈ کے دو قرضے جاری کئے گئے اور زر پرست یہود نے انھیں خرید کر قومی وطن کو مضبوط کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کی ۔۔۔ ہگانہ (یہودیوں کی اعتدال پسند جماعت) اور ارگون زوئی (منظم یہودی دہشت پسند گروہ) میں زبردست اختلافات تھے، مگر اعلانِ حکومت کو تین ماہ نہ گذرے کہ ۱۸ اگست کو سب اختلافات مٹ گئے، اور آگ پانی میں ملاپ ہو گیا، تاکہ قومی وطن آپس کے افتراق و اختلاف سے کمزور نہ ہو۔

کیا یہ تمام حقائق ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے؟ اگر حقیقتاً یہ امر واقعہ ہیں تو ہمارے دعاوی میں صداقت کس حد تک ہے؟ اس بنیادی سوال کو حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ یا تو مسلمان واقعات سے آنکھیں بند کر کے یہ کہہ کر دل خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نام نہاد اور خود ساختہ

حکومت ہے جس کی حقیقت اور بنیاد کچھ نہیں، اور جب دنیا کے اخبارات سرکاری اعلانات اور ریڈیو کی نشریات اس خوش فہمی کو متزلزل کرتی ہیں تو مسلمان قرآن کی بعض آیات اور الٰہی ارشادات پر شک و شبہ میں پڑ جاتا ہے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مغضوب اسرائیلی حکومت کے مالک کیسے بن گئے، جبکہ اللہ نے انھیں مغضوب کہا اور بار بار اس کے کلام میں ان پر غضب الٰہی کا اعلان ہوا۔

اگر ہم بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان اور ان کے اقبال و ادبار کے علل و اسباب پر ذرا بھی غور کریں تو ہرگز کوئی الجھاؤ اور اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا اس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے کہ آیا غضب الٰہی ایک ابدی سزا ہے یا بعض مخصوص خرابیوں کے نتیجہ اور سزا کا نام ہے، ہم مختصراً عروج و زوال کے اسباب پر بحث کرتے ہیں۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ کی اولاد کا نام ہے۔ یعقوبؑ نبی اسحٰقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ "اسرائیل" ان کا لقب تھا۔ اس عبرانی مرکب لفظ کا ترجمہ "اللہ کا بندہ" ہے۔ کتنا اچھا نام ہے "اللہ کے بندے کی اولاد" (بنی اسرائیل)۔ اور واقعی یہ بہت ہی مبارک اور باعظمت قوم تھی۔ قرآن حکیم کے اوراق میں اُس کی پُرشکوہ داستان جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے۔ جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے محبوب کے نام پر اٹھنے والی قوم کو لغزش کی راہوں سے باخبر کر دیا جائے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں　　　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

قرآن حکیم بنی اسرائیل کو بار بار فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (ہم نے تمہیں جہانوں پر اور اہل جہان پر فضیلت بخشی) کہہ کر عظمتِ دیرینہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ان میں بڑے بڑے نبی مبعوث ہوئے۔ سلیمانؑ، داؤدؑ، یوسفؑ اور موسیٰؑ حضرات جیسے اولوالعزم پیغمبر اسی قوم سے اٹھے۔ ان کا درجہ اور مقام اتنا بلند ہے کہ اس قدر مرورِ زمانہ کے باوجود ان کے نام عزت و احترام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیم مسخ اور محرف ہو جانے کے باوجود دنیا ان کی بزرگی کا اعتراف کرتی ہے۔

بنی اسرائیل میں نبوت کے ساتھ حکومت بھی رہی۔ بڑے بڑے باجبروت اور صاحب امر حکمران ان میں پیدا ہوئے۔ داؤدؑ کا عدل و انصاف اور جرند و پرند پر اُن کے پُراثر نغموں کی فرمانروائی اور حضرت سلیمانؑ کی وسیع سلطنت کے چرچے آج بھی زبان زدِ خلائق ہیں۔ ان کی مملکت میں کسی کو یارائے دم زدن اور تابِ مخالفت تھی۔

حضرت موسیٰؑ کی زبانی قرآن انھیں ان الفاظ میں دعوتِ فکر دیتا ہے۔ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ "اے قوم! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کی، کہ تم میں نبی مبعوث کئے اور تمہیں بادشاہت سے نوازا اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا" (المائدہ آیت ۲۰) ـــــ داعیٔ اسلام حضرت محمد صلعم نے بھی انھیں اللہ کا یہی احسان یاد دلایا۔ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ

"اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور تمہیں تمام جہانوں پر شرف و فضیلت عطا کی" (البقرہ آیت ۴۷)

غلامی دنیا کی بدترین لعنت ہے۔ بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے اور انتہائی ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ انتہا یہ کہ ان کے لڑکے مار دیئے جاتے تاکہ قوم پنپ نہ سکے، اور قوم کا نجات دہندہ پیدا ہوتے ہی موت کے آغوش میں چلا جائے۔ اللہ نے یہود کو ایسے ظالم و جابر قہرمان سے بھی نجات دی اور اذ انجیکم من آل فرعون (بقرہ ۴۹۔ ابراہیم ۶) کہہ کر یہ احسان یاد دلایا۔

یہی شرف و مجد کی حامل قوم جب نبوت اور نبوی تعلیم کو فراموش کر بیٹھی، اور حکومت و حکمرانی کے خصائص سے عاری ہوگئی تو گویا ایک آسمانی عذاب تھا جو اُن پر مسلط ہوگیا۔ وہ ذلت، مسکنت اور غضب کے سرگونہ ادبار کی لپیٹ میں آگئے اور "مغضوب علیہم" کی فہرست کے سرخیل بنے۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ اب انھیں دنیا کے کسی خطہ میں حکومت نہیں مل سکتی۔ وہ خلافتِ ارضی اور ریاستِ ملی کے مالک نہیں بن سکتے۔

حالاتِ زمانہ نے بھی مسلمانوں کے اس خیال کو جو ایک عقیدہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا بہت تقویت دی۔ یہودیوں کو نہ نصرانیوں نے منہ لگایا، نہ وہ مسلمانوں کے حلیف بن سکے۔ عیسائی ان کو اپنا مذہبی دشمن سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ پچھلی صدی تک یورپ کی اکثر یونیورسٹی اور درسگاہوں کے دروازے ان پر بند رہے۔ اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف انھوں نے ریشہ دوانیاں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا حجاز مقدس سے نکالے گئے۔ جرمنی سے وہ ملک بدر ہوئے اور جو باقی رہے وہ اس طرح ذلیل ہو کر کہ نہ عام سیر گاہوں میں جا سکتے، نہ سینما گھر اور ہوٹلوں میں داخل ہو سکتے۔ یعنی انسان ہو کر انسانی حقوق سے محروم ــــ اٹلی سے مسولینی نے انھیں مار بھگایا ــــ روسی انقلاب نے انھیں اپنے ہاں کوئی جگہ نہ دی ــــ ماضی قریب کی یہ داستان پڑھ کر فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا پر فضیلت رکھنے والے، نبوت اور مملکت کے حامل دنیا میں اس کونہ سے اس کونہ تک ذلیل کیوں ہوئے؟ کسی ملک اور خطہ میں صدیوں تک انھیں کیوں چپہ بھر زمین نہ ملی؟ اللہ کے قہر و غضب کا شکار کیوں ہوئے؟

آیئے! یہود پر "غضبِ الٰہی" کے اسباب کتاب الٰہی میں تلاش کریں۔ قرآن حکیم میں لفظ "مغضوب" صرف سورۂ فاتحہ کی ساتویں آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اور لفظ "غضب" مختلف آیتوں میں ۱۹ بار آیا ہے متعلقہ آیات کے حوالے یہ ہیں۔ (۱) سورہ بقرہ آیت ۶۱۔ (۲) سورہ بقرہ آیت ۹۰۔ (۳) سورۂ نساء آیت ۹۳ (۴) سورہ اعراف آیت ۷۱۔ (۵) اعراف آیت ۱۵۲۔ (۶) سورۂ مائدہ آیت ۶۰۔ (۷) سورہ انفال آیت ۱۶۔ (۸) سورۂ نحل آیت ۱۰۶ (۹) سورہ طٰہٰ آیت ۸۱ (۱۰) سورۂ شوریٰ آیت ۱۶۔ (۱۱) سورہ فتح آیت ۶۔ (۱۲) سورۂ آل عمران آیت ۱۱۲۔

سورۂ نحل کی ۱۰۶ نمبر والی آیت اور سورۂ شوریٰ کی سترہویں آیت میں روئے سخن عام ہے۔ پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے اگر کوئی ایمان کے بعد کفر و انکار کی راہ اختیار کرے اور اس کا دل کفر کو خوب سمجھ بھی رہا ہو تو اس پر

اللہ کا غضب ہوگا اور دردناک عذاب — دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ کو ماننے کے بعد جھگڑنا اور کٹ حجتیاں کرنا عذابِ الیم اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے — سورۂ اعراف کے نویں رکوع میں قومِ عاد کی نافرمانیوں کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد یہ بیان کہ انھوں نے اللہ کی وحدانیت میں شک کیا اور اللہ کے نبی کو عذاب کی دعوت دی۔ چنانچہ اس سورۃ کی ۷۱ نمبر کی آیت میں بیان کیا کہ آخر کار ان پر عذاب اور غضب نازل ہوا — سورہ فتح کی ساتویں آیت میں منافق اور مشرک لوگوں کا تذکرہ ہے جو مالکِ حقیقی اور اس کے نظام کے باغی اور مخالف ہوکر غضب کا شکار ہوتے ہیں — سورہ انفال کی پندرہویں آیت میں خطاب خود اہلِ ایمان سے ہے۔ "اے ایمان لانے والو! جب جنگ میں کفار سے مڈبھیڑ ہو تو انھیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اگر کوئی پشت دکھا کر بھاگے گا تو وہ اللہ کے غضب کی لپیٹ میں آجائیں گے سوائے اس کے کہ دشمن کو داؤ دینا مقصود ہو یا مُڑ کر اپنے لشکر سے ملنا ہو — سورۂ نساء کی ۹۳ نمبر والی آیت میں ارشاد ہے "جو کوئی کسی اہلِ ایمان کو جان بوجھ کر قتل کرنے کا مجرم ہوگا اس کی سزا جہنم ہے، جہاں ہمیشہ کی سزا ہے اور اللہ کا غضب اور پھٹکار ہوگی"۔

اب صرف مندرجہ ذیل چھ آیات باقی رہ جاتی ہیں۔ جہاں "غضب" کا اطلاق اہلِ کتاب بنی اسرائیل پر ہوتا ہے۔

(۱) سورۂ اعراف کے رکوع نمبر ۱۸ میں ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ چالیس رات کے لئے طورِ سینا پر گئے۔ قوم نے غیر حاضری میں گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ آپ غصہ سے بھر گئے۔ بھائی ہارون کو سخت سست کہا اور قوم کو اللہ کا یہ حکم سنایا۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ (اعراف ۱۵۲)

وہ جنھوں نے گوسالہ پرستی کی، عنقریب ان پر پروردگار کا غضب آئیگا۔ اور دنیا کی زندگی میں ذلت ہوگی، اور بہتان باندھنے والوں کو ہم یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

(۲) سورہ طٰہٰ کے چوتھے رکوع میں طورِ سینا کے واقعہ کے بعد ارشاد ہے۔

كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي وَمَن يَحْلِلْ

عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ (طٰہٰ ۸۱)

جو کچھ تمہیں پاکیزہ رزق دیا گیا ہے وہ کھاؤ اور اس میں حد سے نہ بڑھو۔ ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔ اور جس پر میرا غضب پڑا وہ ہلاک ہوگیا۔

(۳) سورہ بقرہ کے گیارہویں رکوع میں فرمایا کہ قرآن حکیم توریت و انجیل اور انبیائے سابقین کا تصدیق کرنیوالا ہے۔ اگر اہلِ کتاب اس کا انکار کریں گے تو یاد رکھیں۔

فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ (بقرہ ۹۱)

وہ غضب بالائے غضب میں مبتلا ہوگئے اور انکار کرنے والوں کے لئے ذلیل کرنیوالا عذاب ہے۔

(۴) سورہ مائدہ کے رکوع نمبر ۹ میں مومنوں کو ہدایت دی کہ یہود کو دوست نہ بنائیں اس لئے کہ وہ دین سے مذاق

کرتے ہیں پھر یہود کو ان الفاظ میں متنبہ کیا۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ
وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ
عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (مائدہ ۶۰)

کیا میں تمہیں بتا دوں کہ اللہ کے ہاں اس سے بدتر سزا پانے والے کون ہیں؟ وہ جن پر خدا نے لعنت کی اور انھیں بندر اور سور بنا دیا، اور حد سے بڑھنے والوں کا غلام۔ یہ بدترین مقام پر، اور راہ راست سے بہت دور۔

(۵) آل عمران کے بارہویں رکوع میں اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دینے کے بعد فرمایا کہ انھوں نے راہ حق کو نہ پکڑا اور کفر و سرکشی سے باز نہ آئے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (آل عمران ۱۱۲)

تم جہاں انھیں دیکھو گے ذلت ان پر مسلط ہوگی۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ ہوں گے جو اللہ اور لوگوں کی پناہ میں آجائیں۔ اور وہ اللہ کے غضب کی لپیٹ میں آگئے اور ان پر مسکینی پڑ گئی۔ یہ اس لئے کہ وہ آیاتِ الٰہی کا انکار اور ناحق قتل انبیا کرتے تھے۔ اور اس کی وجہ ان کی نافرمانی اور حد سے بڑھنا تھا۔

(۶) سورۂ بقرہ میں مسلسل ۶۔۷ اور ۸ رکوع میں بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (البقرہ ۶۱)

ان پر ذلت اور مسکینی مسلط ہوگئی، اور وہ اللہ کے غضب کی لپیٹ میں آگئے، چونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیا کو ناحق قتل کرتے تھے، چونکہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھے۔

مذکورہ آیات پر معمولی غور و فکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آیات میں یہود پر "غضب الٰہی" مسلط ہونے کے اسباب مندرجہ ذیل بیان کئے گئے ہیں:۔

(۱) پروردگار عالم کو چھوڑ کر گوسالہ جیسی حقیر مخلوق کی پرستش کرنا۔ (۲) افترا پردازی اور بہتان طرازی (۳) حلال و حرام میں تمیز نہ کرنا۔ (۴) کلام الٰہی کا انکار محض قومی عصبیت اور ذاتی ضد و عناد کی بنا پر۔ (۵) آیات و قوانین الٰہی کا کفر۔ (۶) قتل انبیا یعنی جسمانی اور معنوی اعتبار سے نبیوں کی تعلیم مٹانا۔ (۷) نافرمانی اور سرکشی کی زندگی۔

سورۂ بقرہ کی ۶۱ نمبر والی آیت جو اوپر بیان کی گئی ہے، اس کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیں تو اس مغضوب

امت کے خلاف ذیل کے الزامات ہیں جو بار بار دہرائے گئے ہیں :-

(۱) عہد شکنی آیت ۲۷۔ (۲) محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کفر وانکار آیت ۴۱۔ (۳) ذاتی مفاد اور سہل انگاری کی خاطر من گھڑت اور سستے فتوے آیت ۴۱ (۴) حق و باطل میں تلبیس آیت ۴۲ (۵) حق بات اور الٰہی سچائی کو چھپانا آیت ۴۲۔ (۶) دوسروں کو نیکی کی تلقین کرنا اور اپنے عیوب کو بھول جانا۔ "دیگراں را نصیحت و خود را فضیحت" آیت ۴۴۔ (۷) گوسالہ پرستی آیت ۵۱ (۸) "من و سلویٰ" آسمانی خوراک کا کفران اور زمینی پیداوار کی تمنا۔ بالفاظ دیگر اعلیٰ کو ادنیٰ پر قربان کر دینا (آیت ۵۷ تا ۶۱)۔ (۹) آیات میں تحریف یعنی احکام میں من مرضی کی الٹ پھیر آیت ۵۹۔ (۱۰) کٹ حجتیاں کر کے کھلے مسائل و احکام میں بال کی کھال اتارنا۔ آیت ۶۷ تا ۷۱۔ (۱۱) منافقت اور دو رخی پالیسی آیت ۷۶۔ (۱۲) نیکی میں تعاون کے بجائے گناہ اور سرکشی میں اشتراکِ عمل آیت ۸۵ (۱۳) دل پسند احکام کو ماننا مگر مرضی کے خلاف اور مشکل اعمال میں نافرمانی۔ آیت ۸۵۔ (۱۴) دنیوی اور فوری مفادات کو آخرت اور اس کے دور رس نتائج پر ترجیح دینا آیت ۸۶۔ (۱۵) زندگی کی حرص اور موت سے ڈر آیت ۹۴ تا ۹۶۔ (۱۶) سحر اور جادو پر ایمان اور دوسروں کو اس کی تعلیم و تلقین دین کے نام پر آیت ۱۰۲۔ (۱۷) حقائق کی دنیا سے اعراض کر کے امانی اور آرزوؤں میں پناہ لینا۔ آیت ۱۱۱۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ غضب اور ذلت و مسکنت کی سزا جو بنی اسرائیل کو ان کی بدعنوانیوں، انفرادی اور اجتماعی غلط کاریوں کی بنا پر ملی کبھی ان سے دور ہو سکتی ہے یا نہیں؟ وہ الٰہی قہر و غضب جو ایک بار ان پر مسلط ہوا کبھی ان سے دور ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ذلت، مسکینی اور غضب ابدی سزا کے نشان ہیں یا کبھی افراد و اقوام سے ٹل بھی سکتے ہیں؟

حقائق اور واقعات کی دنیا میں جواب اثبات میں ملتا ہے۔ گو یہ حقیقت تلخ ہے مگر ہے امر واقعہ۔ بنی اسرائیل آج مسکنت کے شکار نہیں اس لئے کہ مالی اعتبار سے آج دنیا کے کئی بڑے بڑے بنک اور حکومتیں ان کی محتاج اور مرہونِ منت ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ جیسی سرمایہ دار اور بڑی حکومتیں اگر آج یہود کی ہمنوائی کرتی ہیں تو محض یہودی سرمایہ اور دولت کی بنا پر۔ ورنہ تعداد یا اجتماعی زندگی کے اعتبار، قومی یا بین الاقوامی لحاظ سے یہود کو دنیا کی سیاست میں کوئی حیثیت حاصل نہیں۔

اگر بنی اسرائیل کی مسکنت کی خصائص بدل جانے سے دولت و ثروت میں بدل سکتی ہے تو کیا "غضب الٰہی" ان سے نہیں ٹل سکتا؟ اگر یہ بحث محض قلمی نہ ہو تو واقعات یہ بتلاتے ہیں کہ اسرائیلی ریاست کا اعلان ہو چکا ہے اور ۱۹۴۸ء کے ختم ہونے تک دنیا کی چھوٹی بڑی بیس حکومتیں اس "نام نہاد" اور "خود ساختہ" ریاست کی قانونی حیثیت تو تسلیم بھی کر چکی ہیں۔

قرآن حکیم کے دوسرے حصوں سے قطع نظر اگر صرف ان آیات پر غور کریں جن میں یہود پر غضب الٰہی کے علل و اسباب بیان کئے گئے ہیں وہاں بھی اس ابہام کا جواب موجود ہے۔ مثلاً اس سلسلہ کی پہلی آیت جو اوپر

بیان ہوئی ہے سورۂ اعراف کی ۱۵۲ نمبر کی ہے اور اس کے بعد دوسری آیت یہ ہے :-

(۱) وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (اعراف ۱۵۳)

اور جن لوگوں نے بُرے اعمال و افعال کئے اور پھر اس کے بعد اُن سے رجوع کر لیا (توبہ کر لی) اور ایمان لے آئے تو یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے۔

دوسری محولہ بالا آیت سورۂ طٰہٰ کی ۸۱ نمبر والی ہے۔ اس کے فوراً بعد یہ ارشاد ہے۔

(۲) وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (طٰہٰ ۸۲)

اور جو توبہ (رجوع) کر لے، ایمان لے آئے اور عمل صالح کرے اور پھر راہ ہدایت پکڑ لے تو میں اُسے بخشنے والا ہوں۔

مذکورہ بالا آیتوں میں سے آخری سورہ بقرہ کی ۶۲ نمبر کی آیت ہے جس کے فوراً بعد یہ ارشاد ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ ۶۲)

جو لوگ ایمان لائے یا یہودی، عیسائی اور ستارہ پرست ہیں، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک کام کرے گا تو ایسے لوگوں کے لئے خدا کے ہاں اجر ہے اور نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

بجائے اس کے کہ ہم ریاست اسرائیل کو خواہ مخواہ قرآن حکیم کے خلاف چیلنج قرار دیتے پھریں اور اس وہم میں مبتلا ہو کر الٰہی آیات کی صداقت میں شک و شبہ کریں کیا یہ حقیقت نہیں کہ "مغضوب اسرائیلی" آج اجتماعی اور انفرادی اعتبار سے کئی اعمال و افکار میں اصلح ہو چکے ہیں؟ اور خلافتِ ارضی کے وارث انھیں امراض میں مبتلا ہو کر غضب الٰہی کے شکار ہو رہے ہیں؟ موت سے ڈرنے والے یہودی آج دہشت پسندی اور جرأتِ رندانہ میں میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ مگر "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کے نظریہ پر چلنے والے مومن آج انتشار اور افتراق میں مبتلا۔ پیسہ کے بدلے جان دینے والے سود خور یہودی قوم اور قومی حکومت کے لئے سب کچھ لٹا رہے ہیں مگر اللہ کی راہ میں ہر چیز وقف کر دینے والے آج اس قابل نہیں کہ اپنی ملت اور ملی بقا کے لئے دور نہیں بلکہ گھر کے قریب ہونے والے جہاد میں کچھ دے سکیں ـــــ تو کیا اس سچائی کا اعتراف نہ کر لینا چاہیے؟ تاکہ مرض کے احساس کے ساتھ اس کے علاج کی بھی کوئی صورت ہو سکے۔ اس لئے کہ جہل مرکب میں مبتلا افراد ہوں یا اقوام کبھی اصلاحِ حال کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

طلوعِ اسلام یہ سوال کہ یہودیوں پر ذلت و محکومی کا عذاب مشروط بہ شرائط و خصائص ہے، یا ان کے کسی جرمِ عظیم کی بنا پر یہ سزا قیامت تک کے لئے ان پر مستولی رہے گی، نظری حیثیت سے اکثر ذہنوں میں گردش کرتا رہا ہے۔ لیکن فلسطین میں اسرائیلی ریاست کی تشکیل سے یہ سوال عملی طور پر سامنے آگیا ہے اور اس نے ان لوگوں کو جو سمجھتے تھے کہ "از روئے قرآن" یہودی کبھی اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتے، اس صورتِ حال نے بڑے ضغطہ میں ڈال دیا ہے جس سے ان کا ذہن عجب کشمکش میں مبتلا ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس ارتیاب و اضطراب کا مظاہرہ وہ استفسارات ہیں جو ہم سے بھی اس باب میں کئے جا رہے ہیں۔ ہم نے جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں "فلسطین" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ضمناً اس سوال کے متعلق بھی چند سطور لکھی تھیں۔ بایں ہمہ ہم چاہتے تھے کہ اس عنوان پر کچھ زیادہ تفصیل سے لکھیں کہ اتنے میں حافظ صاحب کا پیشِ نظر مضمون موصول ہو گیا۔

یہودی برنبائے نسل ایک قوم ہیں اور برنبائے عقیدہ ایک مذہب کے پیرو۔ ان کے ہاں مذہب، ایک قوم کی چار دیواری میں محدود رہا ہے۔ لہٰذا مذہبی اور نسلی دونوں اعتبارات سے یہودیوں کی قومی وحدت کی تشکیل ہوئی ہے۔ "مذہب تو چونکہ پھر بھی ایک ایسی چیز ہے جسے اپنی مرضی سے مانا اور چھوڑا جا سکتا ہے اس لئے صرف مذہب کی بنا پر قومیت کے دائرہ سے انسان باہر بھی آسکتا ہے۔ لیکن نسلی اعتبار سے قومیت کے دائرہ سے باہر نکلنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ نہ کوئی غیر نسل کا انسان اس قوم میں داخل ہو سکتا ہے نہ اس نسل کا کوئی انسان اس قوم سے باہر نکل سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کے قانونِ مکافات کی رو سے ایسا تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کی کوئی ایک نسل (Generation) کوئی جرم کرے اور اس کی پاداش میں اس قوم کے قیامت تک کی آنے والی نسلیں سزا میں ماخوذ رکھی جائیں؟ اگر ایسا تسلیم کیا جائے تو یہ عیسائیت کے اسی عقیدہ کے مماثل ہوگا جس کی رو سے وہ تمام بنی آدم کو آدمؑ کے گناہ کی پاداش میں پیدائشی گنہگار تصور کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ قرآن کے قانونِ مجازات کے یکسر خلاف ہے۔ وہ جب باپ کے گناہ کے عوض بیٹے کو نہیں پکڑتا تو ایک نسل کے جرائم کی سزا میں آنیوالی نسلوں کو کس طرح ماخوذ کریگا؟ وہ امم عالم کے متعلق یہ عالمگیر اصول بیان کرتا ہے کہ لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت۔ ان کے نیک و بد اعمال کے نتائج انہی تک محدود ہوتے ہیں۔ اگر کسی جرائم پیشہ گروہ کی آئندہ نسل شریف بن جائے تو وہ ان کے اسلاف کے جرائم ان پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس اصول کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی ایک دور کے یہودی اپنے اسلاف کے گناہوں کی سزا میں ماخوذ نہیں کئے جا سکتے۔ وہ اگر اسی قسم کے عقوبت میں مبتلا ہیں تو اس کے ذمہ داران کے اپنے جرائم ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی ایک دور کے یہودی، ان جرائم سے مجتنب ہو جائیں جن کی سزا میں ان کے اسلاف ماخوذ تھے، تو ان سے یہ سزا ٹل جائے گی اور یہ اپنے عمدہ اعمال کے ثمرات سے بہرہ ور ہوں گے کہ خدا کسی کے اچھے کاموں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

بنا بر عقیدہ (یا مذہب) قومیت کی صورت میں بھی یہ ہوتا ہے کہ جو شخص اس عقیدہ کو اختیار کرے اس مذہب میں شامل ہو جائے اور اس طرح اس قوم کا فرد بن جائے، تو اس عقیدہ کے نتائج میں وہ بھی برابر کا شریک ہو جائے گا۔ اگر عقیدہ غلط ہے تو اس کے نتائج رسوا کن ہوں گے۔ اگر صحیح ہے تو اس کا مآل حسنہ ہوگا۔ لہٰذا جب تک کسی قوم میں غلط عقیدہ موجود رہے گا وہ قوم نسلاً بعد نسلٍ اس کے مہلک نتائج کی سزا میں ماخوذ رہیگی تاآنکہ وہ اس غلط مذہب کو چھوڑ نہ دے۔ اگر غور کیجئے تو بات یہ بھی وہی ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ یعنی اس صورت میں بھی کسی دَور کے انسانوں کو سزا ان کے اپنے ہی عمل کی بنا پر ملتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے نتائج بہت دور رس اور دیرپا ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی ایک جماعت کی مساعی جمیلہ سے ایک ریاست قائم ہو جاتی ہے تو اس کے آنے والے افراد بھی اس کے برکات سے متمتع ہوتے ہیں، لیکن یہ آنے والے افراد اس ریاست کو قائم اسی صورت میں رکھ سکیں گے جب ان میں خود اس کی صلاحیت ہوگی۔ اسی طرح کسی ایک جماعت کی تباہ کاریوں کے مہلک نتائج ان کے آنے والے افراد کو بھی متاثر کر دیتے ہیں لیکن اگر یہ اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لیں تو ان اثرات سے مامون بھی رہ سکتے ہیں۔ (یہ مسئلہ وراثتِ اعمال سے متعلق ہے جس کی تشریح کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔ اس وقت یہی سمجھ لینا چاہیے کہ ہر دَور کے انسان اپنے اعمال کے نتائج کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک دَور کے افراد ان اعمالِ خبیثہ کو چھوڑ دیں جن میں ان کے اسلاف مبتلا تھے لیکن اس کے باوجود ان کی سزا ان پر بدستور قائم رہے)۔

ان مقدمات کی روشنی میں یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں کے دورِ تنزل کے افراد جن جرائم کے مرتکب ہوئے ان کے اثرات اسی صورت میں آگے منتقل ہوں گے جب ان کی آنے والی نسلیں بھی انہی جرائم میں مبتلا رہیں۔ جب ان کی کوئی نسل ان جرائم سے مجتنب ہو کر اپنی اصلاح احوال کر لے گی، اس سزا سے محفوظ ہو جائے گی۔ اگر قانونِ خداوندی کی رو سے یہود کا نحن ابناء اللہ (خدا کی چہیتی اولاد ہونے) کا دعویٰ اس بنا پر باطل تھا کہ خدا کا قرب کسی نسل سے مشروط نہیں بلکہ اعمال سے مشروط ہے، تو یہود پر غضب الٰہی بھی ان کے یہودی النسل ہونے کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتا، ان کے اعمال کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہودی نسل کے افراد، چاہے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہو جائیں، وہ معتوب و مغضوب ہی رہیں گے، خدا کے قانونِ مکافات کے خلاف ہے۔ یا یہ سمجھنا کہ یہودی النسل افراد کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اچھے کام کر سکیں، فطرتِ انسانی کے صحیح مطالعہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ یہودی کچھ ہی کیوں نہ کر لیں، وہ قیامت تک ذلیل و خوار ہی رہیں گے۔

قرآن میں ان کی ذلت و خواری کو ان کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر وہ اعمال بدل جائیں گے تو ان کا نتیجہ بھی بدل جائے گا۔

قرآن میں ایک آیت ایسی ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ ان پر یہ عذاب

قیامت تک رہے گا۔ وہ آیت یہ ہے۔

واذ تاذن ربک لیبعثن علیھم الی یوم القیمۃ من یسومھم سوء العذاب ط ان ربک لسریع العقاب وانہ لغفور رحیم (۷/۱۶۷)

اور (اے پیغمبر) جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے رب نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو انھیں بڑے سخت عذاب میں مبتلا کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا خدا (بدعمل کی) سزا دینے میں دیر کرنے والا نہیں۔ اور ساتھ ہی بخشنے والا، رحمت والا بھی ہے۔

لیکن، علاوہ سیاق و سباق کے، یہ آیت خود اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ عذاب ان کی بدعملیوں کے ساتھ مشروط ہوگا۔ ان ربک لسریع العقاب، اس پر صاف شاہد ہے کہ، یہاں خدا کے قانونِ مکافات کا ذکر ہو رہا ہے۔ پھر اس کے بعد آیت کا آخری ٹکڑہ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں اس حقیقت کو واشگاف کر رہا ہے کہ یہ عذاب غیر مشروط و ابدی نہیں بلکہ اگر یہ لوگ ان اعمال سے باز آ جائیں گے تو خدا کی بخشش و رحمت کے مستحق ہو جائیں گے۔

یہودیوں کی اجتماعی زندگی میں گذشتہ بیس پچیس سال سے جو نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ اس تبدیلیٔ احوال و کوائف کے نتائج سے محروم رہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے مضمون کے اخیر میں اس تبدیلیٔ احوال کی تائید میں جو آیات درج فرمائی ہیں انہیں ان کے برمحل ہونے سے البتہ اختلاف ہے۔ ان آیات میں ایمان کا ذکر ہے (ثم تابوا من بعدھا وامنوا ...... یا من امن وعمل صالحا ...) اور قرآن جب ایمان کا ذکر کرتا ہے تو اس سے وہی ایمان مراد ہوتا ہے جو قرآن کو خدا کی طرف سے آخری ضابطۂ حیات تسلیم کرنے کا دوسرا نام ہے (یعنی نبوت محمدیہ پر ایمان)۔ یہودیوں میں یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن قرآن حکومت و سلطنت کو کبھی نبوت محمدیہ پر ایمان سے مشروط قرار نہیں دیتا۔ دنیا کی حکومتیں تغلب و تسلط سے قائم ہوتی ہیں جن کے لئے شرط صرف حصولِ قوت و وسائلِ سیاست ہے خواہ وہ کسی طریق سے حاصل کر لی جائے۔ نبوتِ محمدیہ پر ایمان سے مشروط خلافت ہے، یعنی وہ حکومت جس میں قرآن کے مطابق نظام قائم کیا جائے اور جس کا مقصود ارتقائے شرفِ انسانیت ہو۔ اول الذکر حکومت حبل من الناس (انسانوں کی پناہ جوئی) سے حاصل ہوتی ہے (جسے ہم نے وسائلِ سیاست سے تعبیر کیا ہے) اور ثانی الذکر حبل من اللہ (تمسک بکتاب اللہ) سے۔ ان دونوں کا ذکر خود یہودیوں کی ذلت و مسکنت کے ساتھ آیا ہے جہاں ارشاد ہے۔

ضربت علیھم الذلۃ این ما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس ... (۳/۱۱۲)

یہودیوں پر ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے۔ الا یہ کہ خدا کے عہد سے یا انسانوں کے

عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو۔

یہودیوں کی فلسطینی ریاست، حبل من الناس (انسانوں کی پناہ جوئی اور سازش) کے ذریعے وجود میں آئی ہے، جس طرح دنیا کی اور سلطنتیں وجود میں آتی رہی ہیں اور آج کل بھی آرہی ہیں یا قائم ہیں۔ یہی نظام سیاست ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس فریبِ نفس میں نہیں رہنا چاہیئے کہ چونکہ خدا کا حکم ہے کہ یہودیوں کی قیامت تک کہیں حکومت قائم نہیں ہو سکتی اس لئے ان کی فلسطینی ریاست یونہی ایک سراب ہے۔ چند دن کے بعد خود بخود مٹ جائے گی" یہ غلط ہے۔ سلطنتیں قوت سے بنتی ہیں اور اسی سے قائم رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ سلطنت جس میں قرآن کے مطابق نظام نافذ ہوتا ہے (اور جسے ہم نے خلافت سے تعبیر کیا ہے) اس کا قیام بھی قوت ہی سے ہوتا ہے اور قوت ہی سے اسے استحکام حاصل ہوتا ہے) لیکن مسلمانوں کی تو یہ حالت ہے کہ انہیں نہ حبل من اللہ حاصل ہے نہ حبل من الناس۔ حبل من اللہ تو اس دن سے چھوٹ گیا جس دن سے انہوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اور حبل من الناس اس دن سے جب سے انہوں نے دنیاوی طاقت کے حصول و قیام کی جدوجہد ترک کر دی۔ خسر الدنیا والاخرۃ ذلک ھو الخسران المبین۔ ذلت و مسکنت کا وہ رسوا کن عذاب، جسے یہ یہودیوں کے لئے ابدی طور پر مقدر سمجھتے تھے آج چاروں طرف سے ان پر مسلط ہو رہا ہے لیکن یہ ابھی تک اپنے آپ کو ابناء اللہ (خدا کی چہیتی اولاد) تصور کئے بیٹھے ہیں۔ اس باب میں خدا کا یہ اٹل فیصلہ یاد رکھئے کہ

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتب

جنت (ارضی و سماوی) کی وراثت نہ تمہاری آرزوں (Wishful Thinking) پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوں پر۔

اس کے لئے اصول یہ ہے کہ

من یعمل سوءا یجز بہ۔ ولا یجد من دون اللہ ولیا ولا نصیرا۔

جو کوئی غلط کام کریگا اس کا نتیجہ اس کے سامنے آجائیگا۔ اور پھر (خواہ وہ کتنا ہی اللہ کی چہیتی اولاد یا خیر امت ہونے کا دعویٰ کیوں نہ کرتا پھرے) اللہ سے ہٹ کر اسے نہ کوئی دوست ملیگا نہ مددگار۔

اس کے برعکس

ومن یعمل من الصلحت من ذکر او انثی وھو مومن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرا (۴/۱۲۴)

اور جو کوئی اچھے کام کریگا، خواہ مرد ہو یا خواہ عورت۔ اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو، تو ایسے ہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ جزائے عمل میں رائی کے برابر بھی بے انصافی نہیں ہوگی۔

اسبابِ زوالِ اُمّت

جناب علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

[مارچ ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں "ایک اہم سوال" کے زیرِ عنوان ہم نے ارباب فکر و نظر کو دعوت دی ہے کہ وہ اس حقیقت پر غور کریں کہ مسلمان اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہیں اور پھر اپنے نتیجۂ تدبر سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی نے فروری ۱۹۳۹ء میں "اسبابِ زوالِ امت" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا۔ ہم طلوعِ اسلام کی دعوت کے جواب میں اس سلسلہ کا آغاز اسی مقالہ سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ کا مستقل عنوان ہی "اسبابِ زوالِ امت" رکھا جائے گا اور جس قدر جوابات موصول ہوں گے اسی عنوان سے شائع کئے جائیں گے۔ طلوعِ اسلام]

اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے سب سے زیادہ حیرت انگیز امر مسلمانوں کا زوال ہے۔ کیونکہ وہ ایسی سچی اور روشن کتاب کے حامل ہیں جو ان کو نہ صرف آخرت بلکہ دنیا میں بھی ہر قسم کی عزت اور بلندی بخشنے کا اعلان کرتی ہے۔

قرآن کا وعدہ حق ہے کہ مومنوں کے لئے امن ہے۔

الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون ۔ (۶/۸۲)

جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو انہوں نے ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا' ان کیلئے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ عزت مومنوں کے لئے ہے۔

ان العزۃ للہ ولرسولہ وللمومنین (۶۳/۸)

حقیقت یہ ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے۔

وکان حقا علینا نصر المومنین (۳۰/۴۷)

اور ہمارے اوپر حق ہے مومنوں کی مدد کا۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (۳/۱۳۹)

اور نہ سست ہو اور نہ غم کرو حال یہ ہو کہ تمہیں سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو

قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہو گا۔

ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا (النساء)

اور اللہ کافروں کو کبھی مسلمانوں کے اوپر راستہ نہ دے گا

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومن کفار پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔

ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لایجدون ولیاً ولا نصیرا (فتح)

اور جو کفار تم سے لڑیں گے تو وہ نہ کوئی پشت و پناہ پائیں گے نہ کوئی مددگار۔

اور قرآن مومنوں کے لئے روئے زمین کی بادشاہت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض (نور)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کئے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا بادشاہ بنائے گا۔

لیکن ان کے برخلاف صدیوں سے مسلمان ایک مسلسل زوال اور انحطاط کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جو سرعت کے ساتھ ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ ان کا بڑا حصہ کفر و شرک سے مغلوب ہو کر محکومیت کے دردناک عذاب میں گرفتار ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ مومن ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ اللہ اپنے وعدے پورے نہ کرتا، اس لئے کچھ خرابیاں ہمارے ہی ایمان و عمل میں ہیں جن کی وجہ سے ہم اُن کے مستحق نہ رہ سکے۔

ہمارے اسباب زوال دو قسم کے ہیں ایک خارجی جو غیر مسلم اقوام کے حرب و ضرب و تغلب و تسلط سے پیدا ہوئے۔ دوسرے داخلی جو خود ہماری بے راہ روی اور سیاسی غلطیوں کی وجہ سے پیش آئے۔ میں انہی داخلی اسباب سے بحث کروں گا۔ کیونکہ ملت کے امراض کے اصلی باعث یہی ہیں۔ انھیں کی بدولت ہم کمزور ہو گئے جس کی وجہ سے دوسروں نے جو توانا اور قوی تر تھے ہمارے اوپر اپنا تسلط جما لیا۔ اگر ان اسباب کے دفعیہ کا سامان ہو جائے تو کمزوری خود بخود جاتی رہے گی۔

لہذا اصل نقطۂ بحث وہی امور ہیں جن کے باعث ہم انعامات الٰہی کے مستحق نہ رہے اور کرم کی جو بارشیں ہمارے اسلاف پر ہوئی تھیں ان سے محروم کر دیئے گئے۔

اس لئے لازم ہے کہ آغاز عہد سے ان کے اوپر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو سکے۔

اسلامی تعلیم کی اصلی روح یہ ہے کہ انسانوں کا حاکم اکیلا اللہ ہے اور سب صرف اسی کے بندے ہیں۔ یہ عظیم الشان منشائے نظریہ ہے جو قرآنی آیات میں جا بجا واضح کیا گیا ہے۔

ان الحکم الا للہ - امر الا تعبدوا الا ایاہ (یوسف)

کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے اس نے حکم دیا ہے کہ تم بجز اس کے کسی کے بندے نہ بنو۔

اسلام کی رو سے ایک انسان دوسرے انسان پر یعنی ایک بھائی دوسرے بھائی پر حکمران نہیں ہو سکتا۔ ان معنوں میں کہ اپنی منفعت کے لئے اپنی منشاء کے مطابق اس پر حکومت کرے۔ بلکہ اسلامی امارت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے احکام الٰہی کی تنفیذ کی جائے اور بس۔ اللہ کے سوا اسلام کسی کو حاکم نہیں تسلیم کرتا۔

خلافتِ راشدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں جس طریق پر امت کو چلایا اس کے متعلق کچھ لکھنا ہی غیر ضروری ہے۔ وہ تو خالص پیغمبرانہ تعلیم اور مربیانہ تربیت تھی جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آپ کا ۲۳ سالہ عہد نبوت گویا ۲۳ موتیوں کی مالا ہے جو زمانہ کی گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ آپ کی صحبت کے فیض سے صحابہ کرامؓ نے خلافت کو انہی اصول پر قائم کیا۔ خلیفہ میں شاہانہ تمکنت اور جاہ و جلال حکومت کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی سڑکوں پر پیدل پھرتا تھا، نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے نہ نقیب، سب لوگ اس سے ملتے تھے اور سب سے وہ ملتا تھا۔ اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں بجز عہدۂ خلافت کے اور کوئی امتیاز نہ تھا نہ اس کو اس قسم کی دینی ریاست حاصل تھی کہ جو چاہے حکم دیدے، وہی مذہبی مسئلہ ہو جائے بلکہ وہ صرف احکام دینی کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

اس خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا اس تیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو وہ سربلندی نصیب ہوئی کہ ترکستان سے بحر خزر تک اور افریقہ میں تونس تک اسلام پھیل گیا اور قوت اس قدر زبردست ہو گئی کہ روئے زمین پر کسی کو ان سے ٹکرانے کا یارا نہ رہا۔ یہ تمام آسمانی برکتیں اور فتوحات اور امتِ اسلامیہ کی یہ عظمت و شان اس وجہ سے تھی کہ سب اسلامی نظام میں منسلک اور لکیلئے اللہ کے فرمانبردار تھے۔ خلیفہ کی ذات میں ان کی مرکزیت تھی جس کی وجہ سے ان کے ملی مقاصد متعین تھے اور ساری امت ایک محور پر گھومتی تھی۔

عہد بنی امیہ خلافتِ راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور آیا۔ جو اس دن سے شروع ہوا جس دن امیر معاویہ کی خلافت پر عام بیعت ہوئی۔ یعنی ۴۱ھ۔ اس دور میں بھی جو ۹۲ سال رہا امت ایک ہی جھنڈے کے نیچے رہی۔ ان خلفاء کی ذات میں بھی امت کی مرکزیت قائم تھی، اور خواہ وہ کیسے ہی رہی ہوں اسلامی قوت اور شوکت کو انھوں نے سنبھالے رکھا۔ بلکہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تو فتوحات کے حدود مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک پہنچ گئے تھے اور بری فوجوں کے علاوہ ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی تھا جس نے سطح آب پر کئی بار رومیوں کو شکستیں دی تھیں۔ دولت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں اہل نصاب راتوں کو اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر گھومتے تھے مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

استبداد مگر باوجود ان خوبیوں کے مرض پیدا ہو چکا تھا۔ یعنی استبداد، وہ استبداد جو اقوام و امم

کے لئے ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اس کا پہلا مظہر خود ان کی خلافت تھی۔ خلفائے راشدین میں سے اگرچہ ہر ایک کی نوعیتِ انتخاب جداگانہ تھی مگر مشورہ اور بیعتِ عامہ یعنی جمہوریت کی روح ہر ایک میں موجود تھی۔ لیکن امیر معاویہؓ جو خلافت بنی امیہ کے بانی ہیں ان کا انتخاب عام نہیں ہوا تھا صرف اہل شام نے ان کو خلیفہ بنایا تھا اور اہل عراق نے امام حسنؓ کو منتخب کیا تھا مگر جب امیر معاویہؓ نے ان پر لشکر کشی کی تو انھوں نے امت میں خونریزی کو ناپسند کرکے مصالحت کرلی۔ لہٰذا اہل عراق نے بھی امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ مگر مغلوب ہوکر اس وجہ سے ان کی خلافت میں تغلب شامل تھا۔ چنانچہ جب حضرت سعد بن وقاص فاتح قادسیہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، امیر معاویہؓ کے پاس آئے تو ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہؓ ہنسے اور کہا کہ اگر تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا بگڑ جاتا؟ انھوں نے جواب دیا کہ جس طریق سے تم نے خلافت حاصل کی ہے اگر مجھے ملتی تو میں کبھی اس کو قبول نہ کرتا۔

غرض اہل نظر اور ارباب صلح خلافت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جو خلفائے راشدینؓ کے عہد میں تھا۔ امیر معاویہؓ کا غلبہ اور تسلط سے اس کو حاصل کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تغلب رضامندی سے بدل گیا۔ کیونکہ امیر معاویہؓ کی خلافت کی قابلیت میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہ تھا۔ لیکن انھوں نے خلیفہ کے انتخاب عام کے دستور ہی کو توڑ ڈالا اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا۔ جس کے بعد سے خلفائے بنی امیہ سلسلہ وار اپنے ہی خاندان کے افراد میں سے جس کو چاہتے تھے ولی عہد بناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خلافت پر استبداد کا رنگ غالب رہا۔ اور ان کی حکومت خاندانی سلطنت ہوگئی۔ مگر چونکہ خلیفہ کا لفظ دینی اقتدار اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اس لئے انھوں نے اس لقب کو ترک نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ وہ لوگوں پر اپنا مذہبی اثر قائم رکھتے تھے۔ بیشک بنی امیہ کی حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہد مستثنیٰ ہے جنھوں نے ان کے مظالم کو مٹا کر خلافتِ راشدہ کی شان قائم کردی تھی مگر ان کا کل زمانہ صرف دو سال پانچ ماہ تھا۔

قہر و غلبہ بنی امیہ کے عہد میں قہر و غلبہ کی حکمرانی تھی۔ یہاں تک کہ عبدالملک نے جو ان کا چوتھا اور سب سے مدبر خلیفہ تھا صاف صاف کہدیا کہ "تم لوگ کیونکر یہ خواہش رکھتے ہو کہ ہم شیخینؓ کے طریقہ سے تمہارے اوپر حکومت کریں۔ پہلے خود تو ویسے بنو جیسے ان کے زمانہ کے لوگ تھے۔" اسی وجہ سے ان کی حکومت میں وہ مظالم ہونے لگے جو اس استبداد میں لازمی ہیں۔ لوگ سختی کے ساتھ دبائے جانے لگے جس کی طرف سے مخالفت ہوتی اس کا سر کٹوا کر مشتہر کیا جاتا تاکہ دوسرے لوگ ڈر جائیں، اور مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

خلفاء کے علاوہ ان کے بعض بعض عمال نے بھی آزاد طبع اور حریت پسند مسلمانوں کو جنھوں نے خلافتِ راشدہ کا عہد دیکھا تھا نہایت سختی کے ساتھ محکوم اور رعایا بنانا شروع کیا۔ زیاد اور

اس کے بیٹے ابن زیاد کے مظالم مشہور ہیں۔ یہ صرف شبہ پر لوگوں کو گرفتار کر کے سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے۔ حجاج بن یوسف کوفہ کے عامل نے جس قدر آدمیوں کو قتل کیا مسعودی کے بیان کے مطابق ان کی تعداد سوا لاکھ سے کم نہ تھی۔

تفریقِ اُمت استبداد کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ ان کی حکومت رعایا کے فائدہ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ حکمراں جماعت کے مقاصد کے لئے ہوتی ہے۔ یہ خلفاء اپنے مخصوص اغراض کے لئے ملت میں وحدت قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ جاہلانہ عصبیتوں کو ابھار کر ان کو ایک دوسرے کا دشمن رکھتے تھے تاکہ ضرورت پر ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلہ میں کام لے سکیں۔ ان باہمی عداوتوں کی وجہ سے خود خلفاء کو بھی خطرہ رہتا تھا اس لئے وہ اپنے ساتھ محافظ دستے رکھتے تھے یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی ان کے لئے مقصورے بنائے جاتے تھے اور جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دائیں بائیں دونوں طرف مسلح سپاہی حفاظت کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ حالانکہ خلفاء راشدینؓ عام لوگوں کی طرح بازاروں میں پھرتے تھے اور سب کے ساتھ مسجدوں میں جاتے تھے اور خود نماز پڑھاتے تھے۔

بیت المال سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خلفاء راشدین عام افرادِ ملت کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور خود اپنے مال سے زیادہ اس کی حفاظت کرتے تھے۔ اس میں سوائے اس کے جو ان کے گذارہ کے لئے مقرر کر دیا جائے اپنی ذات کے واسطے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے۔ اس پر بھی کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داریوں سے قیامت کے دن اگر ہم بلا عذاب اور ثواب کے نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن خلفائے بنی امیہ شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے، بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے اپنی منشا کے مطابق اس کو صرف کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس کا اقتدار خزانہ پر ہوگا وہی ملک کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے۔ یہ خلفاء مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے استبدادی اغراض پر صرف کر کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ جو لوگ ان کے یہاں سے تنخواہیں پاتے تھے ان میں یہ جرأت باقی نہیں رہتی تھی کہ مخالفت کر سکیں، جو نافرمانی پر آمادہ ہوتا اس کی تنخواہ بند کر دی جاتی۔ چنانچہ یزید کے عہد میں اہل مدینہ کی اور ولید کے زمانہ میں آلِ حرم کی تنخواہیں بند کی گئیں، انصار کے وظائف بارہا اس بنا پر روک دیئے گئے کہ اہل بیت کی طرفداری کرتے ہیں۔

مدینہ کا عامل زکوٰۃ کی رقم قریش کے اعیان کو قرض پر دیتا تھا جس کی وجہ سے ان پر اپنا قابو رکھتا تھا جہاں کوئی مخالفانہ حرکت ان سے نمایاں ہوئی فوراً قرض کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی امیہ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

ہوسِ زر خلافتِ راشدہ میں ممالک مفتوحہ سے محاصل اس لئے وصول کئے جاتے تھے کہ

مجاہدین کی ضروریات رفع کی جائیں لیکن بنی امیہ کا نصب العین چونکہ اپنے گھر میں ایک مستقل سلطنت قائم کرنا تھا اس لئے ان کو ضرورت ہوئی کہ طاقتور قبائل و اشخاص پر اپنا اثر رکھیں۔ اس کی صورت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ ان کے سامنے دولت پیش کریں۔ چنانچہ انھوں نے بیت المال کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور جاو بیجا بے دریغ اس کی رقمیں صرف کرنے لگے امراء و رؤسائے قبائل کے علاوہ خطباء و شعراء کو بھی بڑی بڑی رقمیں زبان بندی کے لئے دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ محاصل کی وصولی میں ناجائز سختیاں بھی عمل میں آنے لگیں یہاں تک کہ بعض صوبوں میں ذمیوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ افریقہ اور خاص کر خراساں میں اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ ہم مبلغ ہیں محصل نہیں ہیں اس خلاف اسلام طریقہ کو بند کیا، جس کے بعد لاکھوں ترک حدود سمرقند میں جو اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے، پھر مسلمان ہو گئے۔

مالِ زکوٰۃ کو بھی جس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں، یہ خلفاء اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرتے تھے یہ دیکھ کر عمال حکومت میں بھی دست درازی کی عادت ہو گئی۔ خلفاء بنی امیہ نے ایک مد تحصیل زر کی یہ بھی نکالی کہ عہدوں کو فروخت کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال ان کو اپنی زر خرید جائداد سمجھ کر رشوت، غبن اور جبر ہر طریق سے دولت پیدا کرنے لگے، خلفاء جب ان سے خفا ہوتے تو ان کو برطرف کر کے ان کی جائدادیں ضبط کر لیتے۔

الغرض شخصی اور استبدادی حکومت کی جو لازمی خرابیاں ہیں وہ خلافت بنی امیہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔ خلفاء بنی امیہ اگرچہ مسلمانوں کا مرکز تھے لیکن ان کی مرکزیت خلفائے راشدین کی طرح اخوت، مساوات اور جمہوریت کی مرکزیت نہ تھی، بلکہ انھوں نے ملتِ اسلام کو جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں صرف اللہ کی غلام تھی اپنا غلام بنا لیا تھا۔

بنی عباس بنی عباس جنھوں نے مخفی تبلیغوں سے بنی امیہ کی بغاوت کا بیج بویا اور پھر ان کے مقابلہ کے لئے لوگوں کو کھڑا کیا جب کامیاب ہو کر ۱۳۲ھ میں تخت خلافت پر آ گئے تو انھوں نے بھی وہی استبداد قائم رکھا جو بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ ان میں سے ابتدائی آٹھ خلفاء کا زمانہ جو تقریباً سو برس رہا قوت اور شوکت کا زمانہ تھا، انھوں نے شعائر اسلامی کا احترام رکھا، نمازیں بھی پڑھتے تھے حج بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی حصہ لیتے تھے مگر باوجود اس کے ملک و ملت کو ہمیشہ کے لئے اپنا اور اپنی اولاد کا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ ایک کے بجائے دو دو بلکہ تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے، اور ان عہد ناموں پر اللہ، رسول اور ملائکہ سب کو گواہ بناتے تھے تاکہ یہ جائداد کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جا سکے اور ابد تک ساری ملت اسلامیہ انھیں کے استبداد کے شکنجوں میں رہے۔

خلفاء بنی امیہ کو تو جملہ امت کی مرکزیت بھی حاصل تھی، مگر بنی عباس کے قبضہ سے اندلس روزِ ازل سے خارج رہا جہاں بنی امیہ کے بقایا میں سے ایک شخص عبدالرحمن بن معاویہ نے پہنچ کر اپنی سلطنت قائم کر لی جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد عظمت و شان کے لحاظ سے خلافت عباسیہ کی حریف ہو گئی۔ علاوہ بریں عہدِ بنی امیہ میں قوت کی حکمرانی تھی، کیونکہ ان کی سلطنت اپنی قوم عربوں کی عصبیت اور طاقت پر قائم تھی مگر بنی عباس نے عجمیوں خاصکر خراسانیوں کی مدد سے سلطنت حاصل کی تھی اس وجہ سے کوئی قومی طاقت انکے پاس نہ تھی۔ ان کی خلافت بجز اس کے کہ خلیفہ عرب تھا اور زبان عربی تھی سرتاسر عجمی تھی اور ساری وزارتیں و امارتیں عجمی موالیوں کے ہاتھوں میں تھیں یہی وجہ ہوئی کہ بنی عباس کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خلافت کو ہمارے ہاتھوں سے نکال کر دوسروں کو نہ دیدیں۔ چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کے بالمقابل ترکوں کی بھی ایک فوج مرتب کی تاکہ توازن قائم رکھیں۔ مگر اس ترکی فوج نے خود خلفاء پر تغلب حاصل کر لیا جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جس کو چاہتے تھے معزول بلکہ قتل کر دیتے تھے۔ خلفاء کی اس بے بسی کے زمانہ میں نئی نئی اسلامی سلطنتیں ظہور پذیر ہونے لگیں جن کے غلبہ سے وہ بالکل بے دست و پا ہو گئے۔ دیالمہ اور سلاجقہ کے تسلط کے عہد میں جو صدیوں رہا ان خلفاء کا صرف مذہبی اثر رہ گیا تھا اور حکومت سلاطین کے ہاتھوں میں تھی۔ یہاں تک کہ ۱۲۵۸ء میں افریقہ میں فاطمیہ نے اور اس کے بعد اندلس میں عبدالرحمن ناصر نے اپنی اپنی خلافتوں کا اعلان کر دیا جس سے دنیائے اسلام میں بیک وقت تین خلافتیں قائم ہو گئیں جو ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ اور وہ مرکزیت جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے نصب فرمایا تھا، ان قریشی خانوادوں کی باہمی رقابت اور دنیاوی مناقشت سے بازیچۂ طفلاں بن گئی۔

خلافت کا مقصد یہ تھا کہ جملہ بنی نوعِ انسان صرف حکومت الٰہی کے فرماں بردار ہوں نہ کہ انسانوں کے لیکن خلفاء بنی امیہ و بنی عباس نے اس کو محض خاندانی سلطنت بنانے کی کوشش کی۔ جس کا انجام وہی ہوا جو ہر ایسے دنیاوی کارگاہ عمل کا ہوا کرتا ہے۔ امراء و ولایات نے جب خلفاء کی یہ خود غرضی دیکھی تو ان میں بھی اسی قسم کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے گئے۔ خلفاء کا رسماً صرف اس قدر اثر رہ گیا تھا کہ متغلبین تحفے اور ہدیئے بھیج کر ان سے اپنی اپنی حکومتوں کے فرمان لکھوا لیتے تھے۔ آخر ۱۲۵۶ء میں یہ بے جان خلافت ہلاکو کے ہاتھوں غارت ہو گئی۔

خلفاءِ عثمانیہ بغداد کی عباسی خلافت کی تباہی کے بعد سلاطین مصر نے انھیں بقائے بنی عباس میں سے ایک شخص کو مصر میں خلیفہ بنا لیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی حکومت کو مستحکم رکھیں۔ ان خلفاء کا عزل و نصب خود سلاطینِ مصر کے ہاتھوں میں تھا جن کے وظیفہ پر یہ گزر کرتے تھے۔ ۱۵۱۷ء میں سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کر کے خلافت بھی حاصل کر لی اور اس طرح اپنے دنیاوی وقار کے دستار میں

دینی عزت کا بھی طرہ لگایا لیکن خلفاء عثمانیہ بالطبع اپنے رتبہ سلطنت ہی کو جس کے ذریعہ سے انھوں نے خلافت حاصل کی تھی بالاتر سمجھتے رہے اور سوائے سلطان کے کبھی اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا پسند نہ کیا۔ علاوہ بریں ان کی خلافت بھی خلافتِ عامہ نہ تھی بلکہ ان کے رقبۂ مقبوضہ تک محدود تھی اور انھوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور جزیرۃ العرب کے محافظ ہونے کے جو فتح مصر کے بعد ان کی سلطنت کا جزو ہو گیا تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا یہاں تک کہ حج جس میں اقصائے عالم کے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اور جو اجتماع ملت کا دینی مرکز ہے، اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ بالآخر ۱۹۲۲ء میں جمہوریہ ترکیہ نے اس خلافت کا بھی جو اتحاد ملت کا ایک بوسیدہ رشتہ اور بے معنی ادارہ رہ گیا تھا الغا کر دیا۔ جس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزی زندگی کا نام بھی جاتا رہا۔

موجودہ حالت آج امتِ اسلامیہ کی تعداد تمام عالم میں تقریباً ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوموں کی تعداد سے اگر زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں ہے۔ مگر ان میں سے سوائے ترک، ایرانی، افغانی اور عرب کے جن کی مجموعی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے بقیہ ساری امت غیر مسلم حکومتوں کے قبضہ میں ہے یعنی مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا زیادہ سے زیادہ صرف دسواں حصہ ہے جو آزاد کہا جا سکتا ہے، ان آزاد اقوام مسلمہ کا بھی کوئی ایک مرکز نہیں ہے بلکہ متعدد خود مختار سلطنتوں میں یہ بٹی ہوئی ہیں، عرب جس سے اسلام کا چشمہ ابلا تھا آج اس میں چھوٹی بڑی ۹ سلطنتیں ہیں جن میں سے کوئی کسی کے اثر میں ہے اور کوئی کسی کے۔ یہ سارا نتیجہ ہے امراء و سلاطین امت کی ان مطلق العنانیوں کا جن کی وجہ سے انھوں نے مرکزیت کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے ذاتی اغراض کے پیچھے ملت کے انجام پر نظر نہیں ڈالی۔

جو قومیں دوسروں کی محکوم ہیں ان کا انتشار تو اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ان کے اعمال سے صلاحیت مفقود ہو گئی ہے ادھر کم سے کم دو سو سال کے کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کوششوں اور قربانیوں کے بھی کامیابیوں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ مراکش سے لے کر دیوار چین تک کتنے ہنگامے اٹھے، اور کتنے مجاہدانہ معرکے ہوئے۔ مگر ہر ایک میں نقصان ہی اٹھانا پڑا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور کوئی مرکز نہیں ہے جو اس کی قیادت کرے تاکہ اس میں عملی صالح کی حرکت پیدا ہو۔

ہندوستان کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، اس کی حالت خود آپ کے سامنے ہے۔ یہاں تو ۷ کروڑ کے قریب مسلمان آباد ہیں مگر اجتماعی زندگی کا نام تک نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دن بدن ہر لحاظ سے گرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ کوئی راہ نہیں جس پر سب متفق ہو کر چلیں کوئی کام نہیں جس کو سب مل کر کریں جمود اور تعطل کی زندگی ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں[1]

---

[1] جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ مضمون اوائل ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا تھا۔

ذہنی تشتت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے صرف ایک کتاب لیکر آئے تھے یعنی قرآن کریم جس پر عمل کرکے صحابہ کرام نے دینی اور دنیاوی سربلندی حاصل کی۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا عمل اسی کتاب پر رکھا اور امت کو اس سے ہٹنے نہ دیا جس کی وجہ سے ان کے زمانوں میں کوئی مذہبی فرقہ پیدا نہ ہو سکا اور ساری ملت متحد رہی۔

عہد بنی امیہ میں جب استبداد کا تسلط ہوا تو خلفا نے دنیا کو لیکر دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے حصہ میں آگئی۔ اسی وقت سے اختلافات پڑنے لگے اور شخصیت پرستی کی وجہ سے نت نئے فرقے بننے شروع ہو گئے۔ عباسی عہد میں فقہا میں اختلاف واقع ہوئے، جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی ٹولیاں الگ الگ ہونے لگیں۔ اسی زمانہ میں علوم عقلیہ کے تراجم ہوئے۔ اس وقت سے اختلافات روایات و تاویلات کے باعث یہ ذہنی تشتت اور بھی بڑھ گیا، چنانچہ ایک ہی ملت میں ۷۳ فرقے بن گئے جن میں سے ہر ایک اپنے ہی کو ناجی سمجھنے لگا اور دوسروں کو ناری۔ اس طرح پر ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے امت اسلامیہ کو دو عظیم الشان نعمتیں ملی تھیں ایک قرآن کریم دوسری امامتِ کبریٰ یعنی مرکزیتِ امت جس کو آپ نے نصب فرمایا تھا۔ ملوکیت نے مرکزیت کو فنا کر دیا اور اشخاص پرستی نے قرآن متروک و مہجور کر دیا۔ جس سے دنیاوی اور دینی دونوں لحاظ سے امت میں لامرکزیت پیدا ہو گئی اور یہی زوال کا باعث ہوئی۔

مستقبل امت کی آئندہ صلاح و فلاح کی صورت صرف یہی ہے کہ لامرکزیت چھوڑ کر وحدت کی طرف آئے، یعنی رفتہ رفتہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہو جائے، جہاں سے ملت کے اجتماعی مقاصد کی تعیین اور ان کو عمل میں لانے کی تشکیل ہو اور دینی مرکز قرآن کریم ہو تاکہ ہر قسم کی فرقہ بندی مٹ جائے اور سب کے سب متحد ہو کر ایک راستہ پر گامزن ہوں۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد مسلم اقوام نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور ان کے پیش نظر نہ صرف ملت کا اتحاد عمل ہے بلکہ مرکزیت کا نصب کرنا بھی مقصود ہے۔ اس لئے امید ہوتی ہے کہ شاید ان عروق مردہ میں پھر زندگی کا خون دوڑنے لگے اور ساری امیدیں تو اللہ کے رحم اور کرم سے ہیں جو افراد کی طرح ملت کے گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے!

ارباب حکومت پاکستان کی طرف سے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ملکی اور ملی اصلاح و ترقیع کی رفتار خاطر خواہ اس لئے نہیں کہ حالات غیر معمولی ہیں، حکومت یہ کہہ کر اپنی برأت کر لیتی ہے اور عوام اسے ناکافی سمجھ کر آہستہ خرامی کے شاکی ہیں، نتیجہ وہ افسوسناک خلا ہے جو حکومت اور عوام کو ایک دوسرے سے دور تر کر رہا ہے۔ حالات اگر واقعی غیر معمولی ہیں تو یہ مقام افسوس و گریہ نہیں، نہ یہ وجہ مایوسی بن سکتے ہیں۔ غیر معمولی حالات غیر معمولی عزم و ہمت کے متقاضی ہوتے ہیں اور جو قومیں میدان کارزار میں مجاہدانہ سرفروشی اور سخت کوشی کا ثبوت دیتی ہیں وہ غیر معمولی حوادث سے دوچار ہو کر پختہ تر و پائندہ تر ہو کے نکلتی ہیں۔ ان نازک مراحل میں قومی عمل اس یقین کامل کا مظہر ہونا چاہئے کہ "سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں"۔ تاریخ عالم میں دیگر قوموں پر بھی جاں گسل لمحے آئے ہیں۔ قومیں ایسے ہلاکت کے گردابوں میں پھنسی ہیں کہ بظاہر ان کے بچ نکلنے کے امکانات کالعدم نظر آتے تھے لیکن ان کے عزم مصمم نے موت کے چکروں سے زندگی اور نجات کی سیدھی راہ تلاش کر ہی لی۔ ہمیں ایسی متوازی مثال کے لئے زمان و مکان میں چنداں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ترکی، جس سے ہم نے دیوانہ وار وابستگی کا ثبوت دیا ہے اور جس کی نجات و بقا کے مسئلے ہمارے دلوں کی تپش اور شبوں کا گداز غلغلہ انداز عالم ہوئے، وہی "غازی مصطفیٰ کمال پاشا" جس کی ہم بلائیں لیتے تھے اور جس کے دیدار کی تمنائے بیتاب ہمارے قلوب کے لئے وجہ نشاط تھی، اسی غازی مرحوم کا ترکی اسی طرح غیر معمولی حوادث و آلام کا شکار رہا۔ موجودہ ترکی کی جنگ آزادی اور برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کی جنگ آزادی کی تحریکیں قریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں۔ ترک پہلی جنگ عظیم کے مہیب غار میں گرے مگر اپنی فوق العادہ ہمت سے نئی زندگی حاصل کر کے ابھرے اور جس جنگ حریت کا انھوں نے آغاز کیا تھا اس کا ثمرہ آزاد جمہوریہ ترکیہ کی صورت میں حاصل کر لیا۔ مسلمانان ہند و پاک کو پہلی جنگ عظیم کے صدمات سے بمشکل فراغ ملا تھا کہ وہ تحریک خلافت کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ ترک، اتاترک کی قیادت میں، اس اثنا میں کہیں سے کہیں نکل گئے۔ ۱۹۲۳ء میں آزاد جمہوریہ ترکیہ کا قیام عمل میں آیا، لیکن اس سے ترکوں کو اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا کیونکہ چند ہی سال بعد دوسری جنگ عالمگیر کے بادل گھرنا شروع ہو گئے۔ ترکی پامال ہو چکا تھا، نئی جنگ کی اس میں کہاں سکت تھی؟ اس کی سلطنت محدود تھی، آبادی کم تھی، ذرائع حقیر تھے، یورپی سیاست کی کئی لہریں ترکی میں آ کر متصادم ہوتی تھیں۔ ان از حد نامساعد حالات میں جنیس وانتول

میں زبان کی طرح رہ کر ترکی نے وہ کارہائے نمایاں کئے کہ آنے والوں کے لئے امید اور زندگی کا مستقل پیغام ہیں۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۹ء تک سولہ سالوں میں کہ گذشتہ جنگوں کے اثرات سے بمشکل گلو خلاصی مل سکتی تھی، ترکی پر آنے والی جنگ کا منحوس سایہ بھی پڑنا شروع ہو گیا لیکن ترکی نے ان سولہ سالوں کا پورا فائدہ اٹھایا اور تعمیر ملک پر حتی المقدور توجہ صرف کی۔ اگر ترکی غیر معمولی حالات سے دوچار تھا تو اس کے قائدین بھی فوق العادہ ولولۂ عمل رکھتے تھے، انھوں نے بے پناہ جوشِ عمل اور حسنِ سیرت سے قوم کو غیر معمولی حالات کے مطابق ڈھال لیا اور میدانِ ترقی میں بہت دور نکل گئے۔

اس مختصر سی صحبت میں ہم ترکی کی مساعی تعمیر و اصلاح پر طائرانہ نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس مختصر جائزے سے اندازہ ہو جائے گا کہ ترکی کی جدوجہد میں پاکستان کے لئے کس قدر عبرت و موعظت کا سامان ہے۔ پاکستان بدقسمتی سے "مصطفیٰ کمال" سے محروم ہے۔ لیکن اگر ہمارے قائدین میں کوئی ایک "مصطفیٰ کمال" نہیں تو کیا وہ سب مل کر بھی ایک "مصطفیٰ کمال" نہیں بن سکتے؟ "جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے!"

اس تبصرہ سے یہ مقصود نہیں ہے کہ پاکستان تفصیلی طور پر بھی وہی کچھ کرے جو ترکی نے کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان تفاصیل میں سے بعض سے اختلاف ہو جو وہاں اختیار کی گئی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض جزئیات ہمارے مقتضیات کے مطابق نہ ہوں۔ لیکن ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک ایسی قوم کی مثال موجود ہے جس پر اس سے کہیں زیادہ شدید اور مہیب خطرات گھر کر آ گئے تھے جن سے ہم دوچار ہیں۔ جو ہر اعتبار سے ہم سے بھی بدتر اور نازک تر حالت میں تھی۔ اس قوم نے اپنے آپ کو ان حالات میں نہ صرف محفوظ ہی رکھا بلکہ دنیا کی زندہ قوموں میں اپنا شمار کرا لیا۔ اس نے یہ کیسے کیا؟ یہ چیز ہمارے لئے نمونہ اور تقلید کا باعث بن سکتی ہے۔ اور یہی اس تبصرہ کی غایت ہے۔

موجودہ ترکی، پاکستان کی طرح، از غیب معرضِ وجود میں آیا۔ پہلی جنگ عظیم تک ہم جس ترکی سے شناسا تھے، بلکہ جس کے خلیفہ کو اپنا خلیفہ، خلیفۃ المسلمین، سمجھتے تھے، اس عثمانی ترکی کا تعلق موجودہ کمالی ترکی سے اسی قدر ہے جس قدر کہ سابقہ برعظیم ہند کا تعلق نوزائیدہ سلطنت پاکستان سے ہے۔ کمال اتاترک کا ترکی ایک نوزائیدہ سلطنت سے یا تھی، بعینہٖ ایسے جیسے ہمارا پاکستان۔ پاکستان بطور خطۂ ارض پہلے سے ہی برصغیر ہند کے نقشہ پر موجود تھا، اس کے وہ باشندے بھی اس پر آباد و مکین تھے جو اب پاکستانی کہلاتے ہیں۔ پرانے "پاکستان" اور نئے پاکستان میں فرق یہ ہے کہ اب اہل پاکستان دورِ غلامی سے نکل کر اور آزاد و خود مختار ہو کر اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنے مزاجِ قومی کے مطابق اجتماعی زندگی کو ڈھال سکیں۔ سلطنت عثمانی اور موجودہ ترکی میں بھی یہی فرق ہے کہ موجودہ ترک دورِ غلامی سے نکل کر آزاد و خود مختار ہو گیا ہے۔ اب وہ کسی کا حاکم نہیں، نہ محکوم ہے۔

ترکوں کی جنگ آزادی کا آغاز ۱۹۱۸ء سے ہوتا ہے جبکہ کمال پاشا کی قیادت میں ترک نوجوانوں نے ترکی کو ترکوں کے لئے آزاد کرانے کا عزم کیا۔ یہ جنگ آزادی ۱۹۲۳ء میں ختم ہوئی جب کمال پاشا نے سلطنت عثمانی

کے مرد بیمار کی تجہیز و تکفین کر کے آزاد ترکی کی طرح ڈالی۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر قبضہ کر لیا اور سلطنت عثمانی افریقہ سے بے دخل ہو گئی۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان نے اسے یورپ سے پسپا کر دیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے اس کے تابوت میں آخری میخ بھی گاڑ دی اور دول عظمیٰ نے ترکی کے حصے بخرے کر دینے کے لئے لپکنا شروع کیا۔ عثمانی مرد بیمار ان جنگوں سے جانبر نہ ہو سکا، وہ پوری طرح شکست کھا چکا تھا۔ جنگوں کے ان مہیب زلزلوں سے عثمانیوں کے "کوہ و دشت" مانند سحاب اڑ رہے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ترکوں کے اعماق قلوب سے زندگی اور آزادی کے نئے چشمے بھی پھوٹ رہے تھے۔ بیسویں صدی کا یہ معجزہ نما سمہ ہے کہ ترک شکست کھا کر فتحیاب ہوئے۔ اگر جنگ عظیم میں ترک فتح حاصل کر لیتے تو شاید وہ ان کی شکست ہوتی۔ انھوں نے اپنی خاکستر سے ایک نئی سحر تعمیر کی۔

یورپ کا مرد بیمار محض عسکری نقطہ نگاہ سے ہی بیمار نہیں تھا بلکہ وہ از سرتا پا مجموعۂ امراض بلکہ مجسم مرض تھا۔ عثمانی نظام سلطنت از حد فاسد و بوسیدہ ہو چکا تھا۔ دین و دنیا کہ ایک ہی کل کے دو اجزا ہیں زندگی کے دو جداگانہ دوائر بن گئے تھے۔ سلطان خلیفہ بھی تھا۔ سلطان کی حیثیت سے اس کا ایک وزیر اعظم تھا اور خلیفہ کی حیثیت سے "شیخ الاسلام"۔ شیخ الاسلام کا فریضہ تھا کہ جب کوئی قانون منظور ہو تو وہ اس کا معائنہ کرے اور فتویٰ دے کہ آیا وہ "اسلام" کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ ثنویت مرکزی حدود سے نکل کر نظم و نسق حکومت کے تمام شعبوں پر حاوی تھی۔ دنیاوی عدالتیں علیحدہ تھیں اور مذہبی علیحدہ۔ سکول علیحدہ تھے اور مدارس علیحدہ۔ صوبوں میں بیک وقت حاکم (گورنر) بھی تھے اور مفتی بھی۔ سلطنت کا خزانہ تک علیحدہ تھا اور بیت المال علیحدہ۔ اس ثنویت کی عملی کارفرمائی کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ایک ہی نمونہ کافی رہے گا۔ ایک موقعہ پر حدود مملکت میں اس کثرت سے افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ حکومت کو ان کا سد باب کرنے کے لئے حرکت کرنا پڑی۔ مجلس وزراء نے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ فلاں حجام کی گردن اڑا دی جائے (تاکہ افواہوں کا مزعومہ سرچشمہ بند ہو جائے)۔ اس پر شیخ الاسلام بولے: ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا حجام ہے۔ مجلس وزراء نے جواب دیا: اسی کے رہنے کیا تخصیص ہے۔ اس کے پڑوسی حجام کا سر اڑایا جا سکتا ہے!

اس ہمہ گیر شکست و ریخت اور ذہنی اور جسمانی شغل میں غیور ترکوں نے تعمیر وطن کا عزم کیا۔ ان کا پیش نہاد ایک قوی، صحیح الجثہ اور ہنرمند قوم کی تربیت تھا۔ قومی جوہر صدیوں سے خوابیدہ تھا۔ عوام جاہل اور مفلس تھے۔ ان کے ذرائع محدود اور حقیر تھے۔ مصطفیٰ کمال اور ان کے رفقاء بیرونی اعداء سے عہدہ برآ ہو چکے تھے۔ اب کوئی بیرونی دشمن پیش نظر نہیں تھا۔ اب جنگ کی نوعیت پہلی جنگوں سے یکسر مختلف تھی۔ ان کی نئی جنگ خود اپنے خلاف تھی۔ صدیوں کے تساہل اور جمود سے نکل کر انھیں زندگی کی نئی راہوں پر گامزن ہونا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے جس بلاغت فکر، بشارت عمل کا مظاہرہ کیا وہ ایک حیرت انگیز داستان ہے، اور اس کا بین ثبوت کہ ایک مرد میدان و کار کا دائرہ عمل بے حدود و بے ثغور ہے۔ آغاز سفر میں مصطفیٰ کمال نے قومی نمائندوں یعنی [illegible] ملی کے

ارکان سے خطاب کیا۔ یہ خطاب خیالات و افکار کا نہ تھمنے والا دھارا تھا۔ کمال آٹھ دن تک متواتر بولتا رہا۔ اس نے اس خطاب کی تیاری کے لئے کچھ نہیں کیا، نہ مسودہ تیار کیا نہ یادداشتیں مرتب کیں۔ ترکی کا ماضی اور حال اس کے دل بصیر و خبیر پر کما حقہ روشن تھا اور وہ جانتا تھا کہ ترکی قوم کی تقدیر کو کیا ہے۔ کمال نے قرونِ ماضیہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا، اپنی جنگِ آزادی کا جائزہ لیا اور اس جمہوریت کا احساس دلایا جس کی طرح ڈالنے میں ترک کامیاب ہو چکے تھے اور جس کی تعمیر کے گراں بار فریضہ سے انھیں سبکدوش ہونا تھا۔ اس نے ان نمائندوں کو بتایا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں اور انھیں سب کچھ درکار ہے۔ جو آزادی انھوں نے عظیم الشان قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے اس کا آئندہ کے لئے تحفظ بھی کرنا ہوگا اور انھیں اس کے تحفظ کے لئے مطلوبہ قوت فراہم کرنی اور موجود رکھنی ہوگی۔

مصطفےٰ کمال نے ژرف نگاہی سے قوم کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا اور ان کو تقدیر نو کی میزان میں دیکھا۔ اس کے قوائے فکر و عمل بے پناہ تھے۔ وہ سوچنے اور کر گزرنے کا قائل تھا۔ وہ جب کسی اقدام کا فیصلہ کر لیتا تھا یا اسے قوم کے لئے ضروری سمجھتا تھا تو وہ غیر معمولی محنت اور جانفشانی سے اس کے لئے مادی وسائل مہیا کر لیتا تھا۔ اس کا طریق فیصلہ حیران کن تھا اور عمل بے پناہ۔ اس نے دیکھا کہ مشرق پر سکوتِ مرگ چھایا ہوا ہے اور مغرب جہدِ حیات کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس کے ولولۂ عمل کی تسکین مشرق کے قبرستان میں نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بے اختیار جانبِ مغرب چل نکلا۔ اسے کم سے کم وقت میں سب کچھ کرنا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ گوارا نہیں کیا کہ مغرب جن مسائل کو حل کر چکا ہے ترکی از سرِ نو ان مسائل سے دوچار ہو اور ان کا حل سوچنے پر مزید وقت ضائع کرے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ترکی ذہنیت میں ارتقاء نہیں ہوا بلکہ وہ یکایک معرضِ وجود میں آگئی۔ معرضِ وجود میں کیا آئی اسے قوم پر مسلط کیا گیا۔ یورپ نے جو نتائج صدیوں کی کشمکش اور تجربوں کے بعد حاصل کئے ترکی ایک دن میں ان پر عمل پیرا ہو گیا۔ اس نے مجرب نسخوں کو پھر سے نہیں آزمایا اور بوسیدہ معتقدات و نظریات کو ایک لمحہ کے لئے بھی عزیز نہ جانا۔ اس طرح مصطفےٰ کمال نے چند سالوں میں ہی ترکی کی ہیئت تبدیل کر دی۔ یہ انقلاب خارج میں ہی نہیں تھا بلکہ اس کے دھارے روحِ قومی کے منبع سے پھوٹے۔ یہ موقع اس بحث میں الجھنے کا نہیں کہ کمال تقلیدِ مغرب میں کہاں تک حق بجانب تھا۔ تقلیدِ مغرب کا اعتراض کرنے والے اکثر بے بصری کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ کمال کے گرد و پیش کا کما حقہٗ احساس نہیں رکھتے۔ اس اعتراض کی حقیقت کچھ بھی ہو، یہ صحیح ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال جذبات کی دلفریب مگر پرپیچ وادیوں میں کھو جاتا تو آج ترکی کا ہی نہیں، دنیائے اسلام کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

مصطفےٰ کمال نے قدیم قسطنطنیہ کی روایتی مشرقیت اور اس کے رفیع و عظیم محلاتِ شاہی کی پرتکلف فضا کو خیرباد کہہ کے اندرونِ ملک انگورہ کو دارالحکومت بنایا جس کا نام بعد میں بدل کر انقرہ رکھا گیا۔ انگورہ استنبول کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ تھا اور تجارتی نقطۂ نگاہ سے بھی زیادہ موزوں مرکز تھا۔ نیز انگورہ کے گرد و نواح کی فضا ترکوں کی روایتی عسکریت کی پرورش کے لئے بہترین ماحول تھا۔ یہ نئی فضا ان جراثیم سے پاک تھی جو عثمانی سلطنت کو دیمک کی طرح چاٹ گئے تھے۔ اس نئی فضا میں نئی قومیت کی داغ بیل ڈالی جا سکتی تھی۔

صحرا کے درمیان بے آب وگیاہ علاقہ میں ایک پہاڑی کے اوپر انگورہ کا گاؤں آباد تھا۔ یہ گاؤں جفاکش اور سخت کوش ترکوں کا مستقر منتخب ہوا۔ نئی سلطنت کے نئے دار الحکومت کے لئے پانی اور بجلی کی وافر مقدار میں اشد ضرورت تھی اور انگورہ کے ضلع میں نہ پانی تھا نہ بجلی کا سرچشمہ۔ ترک کی فطرت نے اقبالؒ کے الفاظ میں خدا کو خطاب کیا:

بیابان وکہسار وراغ آفریدی خیابان وگلزار وباغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

قدرت کی کمی کو پورا کر لینے کا عزم مصمم کر لیا گیا۔ ایک وادی منتخب ہوئی، اس میں کا ایک گاؤں جلا دیا گیا، اور علاقہ بھر کے ندی نالوں کا رخ بدل کر اس وادی کی طرف پھیر دیا گیا۔ اس طرح پہاڑوں کے اوپر ایک وسیع و عریض مصنوعی جھیل بن گئی۔ جس کے ایک سرے پر انھوں نے اپنے سرمایہ سے ایک بند بنا دیا۔ ضلع انقرہ کی آبپاشی اسی جھیل سے ہوتی ہے اور اسی جھیل سے پینے کا پانی بھی مہیا کیا جاتا ہے اور بجلی پیدا کرنے کے کارخانے بھی اسی سے قائم ہو گئے ہیں۔ مصطفےٰ کمال نے اسی بے وگیاہ علاقہ میں ایک مثالی زرعی فارم قائم کیا۔ یہ "غازی فارم" آج بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں زراعت کے جدید ترین تجربے کئے جاتے ہیں۔ ہر کسان اس میں آکر نئے تجربے حاصل کر سکتا ہے اور بیش قیمت مشورے لے سکتا ہے۔ اخراجات کے لحاظ سے یہ فارم خود کفیل ہے۔

زرعی فارم سے بات عمومی زراعت کی طرف آگئی۔ یہ بھی ملاحظہ کر لیجئے کہ ترکی نے کیا زرعی انقلاب پیدا کیا۔ جریدہ "فنانشل ٹائمز" لندن کا نمائندہ خصوصی جریدہ کی یکم فروری سنہ ۱۹۳۸ء کی اشاعت خاص میں لکھتا ہے:

مجھے ایک ایسا زرعی ادارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں نہایت عرق ریزی اور جامعیت سے اس کا جائزہ لیا جا رہا تھا کہ کون کون سے علاقے کس کس زرعی پیداوار کے لئے موزوں ترین ہیں۔ (ماہرین کے) گروہ کے گروہ اطراف واکناف میں پھیل گئے ہیں اور وہ تجربوں پر تجربے کر رہے ہیں کہ مختلف پھل اور زرعی پیداواریں کس طرح مختلف زرعی زمینوں میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے بہتر سے بہتر نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ جب نتائج برآمد ہوتے ہیں ادارہ کو اس کی اطلاع بھیجدی جاتی ہے جہاں سے وہ اطلاعات وزارت زراعت کے حوالہ کر دی جاتی ہیں۔ وزارت اس کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ فلاں فلاں علاقے میں صرف فلاں فلاں قسم کی چیزیں ہی اگائی جا سکتی ہیں، کیونکہ ان کی زمین اور آب و ہوا صرف انہی کے لئے موزوں ترین ہے۔ اس روش کے نتائج غیر معمولی طور پر خوشگوار اور حیران کن نکلے ہیں۔ اس کے علاوہ کاشت کے سلسلہ میں مشینوں کا کثرت سے استعمال ہو رہا ہے اور امدادی مجالس کے طفیل جدید ترین آلات کے ذریعہ سے زرعی ترقی کے نئے مدارج طے ہو رہے ہیں۔

محنت اور مستعدی سے ترکی نے زرعی اجناس کی کیفیت اور کمیت میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا ہے۔ اس سے اسے صنعتی ترقی میں بھی بہت مدد ملی، کیونکہ مختلف صنعتوں کے لئے جن خام اجناس کی ضرورت تھی وہ وافر مقدار اور بہتر حالت میں خود ترکی سے ہی دستیاب ہو گئیں اور اسے بیرونی ممالک سے گراں اجناس خرید کر قومی دولت کو ضائع نہیں کرنا پڑا۔ اس طرح اب ترکی جو خام اجناس برآمد کرتا ہے اس سے قابل قدر مالی منافع حاصل ہوتا ہے۔

جنگِ عظیم میں شکست کھا جانے کے بعد ترکی مالی لحاظ سے مفلس ہو چکا تھا۔ دشمن اس کی اس کمی اور مجبوری سے بخوبی واقف تھے۔ لوزان کانفرنس میں عصمت انونو نے جس چابکدستی سے لارڈ کرزن کو شکست دی وہ حیرت انگیز داستان ہے۔ چنانچہ جب قدم قدم پر عصمت انونو نے کرزن کے مطالبے ٹھکرائے اور مطلوبہ مراعات کو یکے بعد دیگرے مسترد کرنا شروع کیا تو لارڈ کرزن نے یوں دھمکی دی:

امن قائم ہو جانے کے بعد ترکی کا حشر کیا ہو گا؟ آپ کو سارے ملک کی از سرِ نو تعمیر کرنا ہو گی۔ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو گی۔ (آپ جانتے ہیں کہ) روپیہ میرے ملک میں ہے، لندن میں! آپ جب بھی روپیہ حاصل کرنے کے لئے ہم سے گفتگو کریں گے میں یہ روکے ہوئے کاغذات سامنے رکھ دوں گا۔ (اور بزور منوا لوں گا!)

مالی بحالی اور ترقی کے لئے ترکی کے پاس ذرائع نہیں تھے۔ سابقہ عثمانی سلطنت اس ضمن میں بدنام تھی۔ نئی سلطنت کی ساکھ قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ شروع میں کسی کا دست نگر نہ ہوا جائے۔ لیکن ترکی میں نہ بنک تھے نہ بنکوں کا مناسب تجربہ ہی ترکوں کو حاصل تھا۔ بلکہ ایک بین الاقوامی ماہر بنک کی حتمی رائے تھی کہ ترک بنک چلا ہی نہیں سکتے۔ کمال پاشا نے ۱۹۲۱ء میں ایک بنک قائم کرنا چاہا لیکن حالات ناسازگار تھے اور وہ کچھ جھجکا بھی۔ بالآخر اس نے ایک لاکھ ترکی پونڈ ایک غیر ملکی بنک سے کہ جہاں وہ جمع تھے نکلوائے اور انھیں ایک تھیلے میں ڈال کر ایک دکان میں رکھ دیا اور جلال بایار کو بلایا (جو بعد میں ترکی کا وزیر اقتصادیات اور پھر وزیر اعظم بنا) اور کہا کہ یہ لو روپیہ۔ آج سے تم ترکی کے نئے بنک کے ڈائرکٹر ہو۔ یوں ترکی کا نیا بنک شروع ہو گیا۔ کامل ترکی سرمایہ سے اور کلیتہً ترکی عملہ سے ۱۹۳۶ء میں خالصتہً ترکی بنکوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی۔

ترکی نے اپنے بجٹ کو ہمیشہ متوازن رکھا۔ اس نے کوئی قرضہ نہیں لیا اور سابقہ قرضوں کی ادائیگی میں پوری دیانت داری کا ثبوت دیا اور باقاعدہ بروقت ادا کئے۔

تعلیمی حیثیت سے ترکی ایک پسماندہ ملک تھا۔ اس کا تناسب خواندگی ۱۵ فی صدی تھا۔ کمال ترکی کو تقدیر سے ہمکنار کر رہا تھا اور اس کے لئے تعلیم اشد ضروری تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہمہ گیر جہالت کی ایک وجہ عربی رسم الخط اور دیگر لسانی اشکالات ہیں۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ رسم الخط لاطینی ہونا چاہئے اور زبان کو

غیر ضروری الفاظ سے پاک کر دینا چاہئے۔ کمال جب ایک بار خیال کر لیتا تھا کہ کوئی شے قوم کے حق میں مفید ہے تو وہ نہایت جرأت سے اور بلا خوف لومۃ لائم اسے نافذ بلکہ مسلط کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ عام حکم ہو گیا کہ سوائے لاطینی رسم الخط کے اور کوئی رسم الخط استعمال نہ ہو۔ کمال نے خود لسانیات کا وقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس انقلابی تبدیلی کے لئے وہ کچھ کیا جو ماہرین سے نہ بن پڑتا تھا۔ رسم الخط بدلنے اور زبان آسان کر دینے کے بعد قوم کو خواندہ بنانے کی مہم شروع ہو گئی۔ سکول کھلے، کالج قائم ہوئے، یونیورسٹیاں بنیں۔ تعلیم عام، جبری اور مفت ہو گئی۔ خود کمال گاؤں گاؤں، قریہ قریہ پھرتا، بازاروں میں، گلیوں میں، درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر عوام کو سبق پڑھاتا اور ان سے سبق سنتا۔ اس طرح سارا ترکی ایک سکول بن گیا جس کا ہیڈ ماسٹر کمال تھا۔ چند ہی سالوں میں ناخواندگی کا تناسب ۸۵ سے ۲۵ فی صدی ہو گیا۔

کمال انتھک تھا۔ وہ سائنسدانوں اور ماہرین کی صحبت میں دنوں کسی موضوع پر غور و فکر کر سکتا تھا۔ کوئی موضوع ہو اس کا ذہن اس پر غور کرنے کے لئے مستعد ہوتا تھا۔ عصمت انونو کا بیان ہے کہ کمال چوبیس چوبیس گھنٹوں تک بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کے لئے مسلسل کتابوں اور کاغذات میں محو رہا ہے۔ جب کوئی مسئلہ اس کے سامنے آجاتا تھا تو وقت کا تصور ختم ہو جاتا تھا، نہ اسے آرام ہی کی سوجھ سکتی تھی۔

کمال انتھک ہی نہیں تھا، وہ بے پناہ جرأت کا مالک تھا۔ وہ فیصلہ کر لینے کے بعد پہاڑ کی طرح اٹل ہو جاتا تھا۔ جب اس نے دقیانوسیت اور قدامت کے مظہر رومی ٹوپی کو اڑا دینے اور اس کے بجائے ہیٹ کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ایک دن پوچھا کہ ترکی میں سب سے زیادہ قدامت پسند علاقہ کونسا ہے؟ جواب ملا، کسٹومونو۔ اس کا کونسا حصہ مولویت کا گھر ہے؟ دادے! دوسری صبح کمال اپنی کار میں بیٹھ کر دادے پہنچ گیا اور وہاں کے رہنے والوں کو جمع کر کے اپنا ہیٹ دکھایا اور انہیں بتایا کہ آئندہ انہیں یہی پہننا ہوگا۔ قدرتی طور پر اس فیصلہ اور اقدام کو شروع شروع میں ایک "مذاق" سمجھا گیا۔ لیکن کمال نے ایک تاریخ معین کر کے اعلان کر دیا کہ اس کے بعد جو شخص اس ٹوپی کو استعمال کرے گا اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ بظاہر یہ معمولی اور غیر اہم سا مسئلہ ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمال کی نگاہ کس قدر ہمہ گیر تھی اور وہ فیصلوں کی ترویج میں کس قدر متشدد تھا۔ کسی فیصلے کیلئے اسے یہ یقین کافی ہوتا تھا کہ وہ قوم کے حق میں مفید ہے۔ اس یقین کے بعد وہ اسے بغیر رائج کئے ٹلتا نہیں تھا۔ کوئی اقدام اس کے نزدیک غیر اہم نہیں تھا۔

کمال کی شخصیت ایسی موثر اور بے پناہ تھی کہ وہ کسی وقت کسی مجمع میں چلا جاتا اور اس کا رنگ بدل دیتا۔ افراد اتنے موثر ہوتے کہ ان کی مایوسی کافور ہو جاتی اور اعتماد ذات ابھر آتا۔ ایک دوسرے سے مربوط ہو کر سب مل کر اتاترک کے پیچھے ہو لیتے۔ اپنی قوم کا یہ قائد پوری طرح ہر دلعزیز اور محبوب تھا۔ قوم اور کمال کے مابین کوئی خلا نہیں تھا!

کمال نے جب صنعتی ترقی کا فیصلہ کیا اور پنج سالہ اوقات نامہ تیار کیا تو اچھے اچھے ماہرین دنگ رہ گئے

ترکی ایسا قلاش ملک اس حسین خواب کو کیسے متشکل کر سکے گا؟ سرمایہ نا پید اور صنعتی ہنرمندی مفقود! بیرونِ ملک سے ماہرین بلائے گئے اور انھیں شاہانہ مشاہرے دیئے گئے، لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ساتھ ساتھ ترکوں کو بھی تیار کریں۔ ہر ماہر کے ساتھ ایک معاون ترک لگا دیا گیا۔ میعادِ معاہدہ ختم ہو جانے پر وہ ترک غیر ملکی ماہر کی جگہ لے لیتا تھا۔ اس طرح چند ہی سالوں میں زندگی کے ہر قابلِ ذکر شعبہ میں ترک ماہرین تیار ہو گئے اور ملک غیر ملکیوں کا محتاج نہ رہا۔

ہم نے کمال کے چند اقدامات پر سرسری تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرہ کو ترکوں کی جدوجہد کا جائزہ نہیں کہا جا سکتا نہ یہ مقصود ہی تھا۔ ہم ترکی کی مثال دے کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مردانِ کارِ ہمت بلند سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ کمال کا جہاد اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ غازیانِ سخت کوش کس طرح قوموں کو نئی زندگی بخش دیتے ہیں اور قومیں ان کے دم سے کس سرعت سے بامِ عروج و ترقی پر پہنچ جاتی ہیں۔ آج پاکستان کیلئے بہترین قابلِ تقلید مثال ترکی کی ہے۔ پاکستان ترکی کے تجربات سے بہت حد تک مستفید ہو سکتا ہے۔ بلکہ دونوں ممالک کی مشابہت کے پیشِ نظر کئی اعتبارات سے پاکستان کو تنہا ترکی سے ہی مدد مل سکتی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اربابِ حکومتِ پاکستان نے ہنوز اس مشابہت کے فوائد کا کما ینبغی احساس نہیں کیا۔ ترکی سے پاکستان کی وابستگی دیرینہ ہے۔ لیکن ابھی تک ہمیں وہاں کے حالات کا بھی ٹھیک ٹھیک علم نہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حجابات کو دور کر دیا جائے اور ان سابقون الاولون کے اقدامات سے پوری طرح استفادہ کیا جائے۔ تعجب ہے کہ ابھی تک ترکی میں سفیر تک کا تقرر نہیں ہوا، چہ جائیکہ نمائندگانِ حکومت گروہ در گروہ وہاں جائیں اور اپنے اپنے شعبوں سے متعلق مناسب معلومات حاصل کریں اور بچشمِ خود دیکھیں کہ بعینہٖ ایسے مسائل کو ترکی نے کس طرح حل کیا۔ ترکی کی مثال پاکستان کے لئے نہایت قابلِ قدر ہو سکتی ہے۔ ہم اس کی لغزشوں سے بچ سکتے ہیں اور تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس طرح بہت سا قومی وقت بچ جائے گا جو خواہ مخواہ کے تجربوں میں لامحالہ صرف ہو گا اور جن کے نتائج تضیعِ وقت کے لحاظ سے غیر متناسب حد تک کم ہوں گے۔

باب المراسلات

مسلم لیگ کی تنظیم جدید "مسلم لیگ کے ایک سابق کارکن" تحریر فرماتے ہیں:۔

طلوعِ اسلام کے شمارہ ماہ فروری میں آپ نے پاکستان مسلم لیگ کی تنظیمِ جدید کے متعلق جن حقائق کا تذکرہ کیا ہے ان کے پیشِ نظر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جس مسلم لیگ کو پاکستان کے استحکام کے لئے اس قدر ضروری سمجھ کر باقی رکھا گیا ہے وہ کن عناصر پر مشتمل ہے اور ان عناصر سے مرکب جماعت وحدتِ ملت (جو استحکامِ پاکستان کا دوسرا نام ہے) کا کس حد تک سامان مہیا کر سکتی ہے۔

لیگ کے سابقہ دور میں مجھے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے خدمت کا موقع تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد لیگ کے بقا کو مفید نہ سمجھتے ہوئے میں اس کا رکن نہیں بنا لیکن مجھے اس کی تنظیمِ نو سے گہری دلچسپی ضرور رہی ہے۔ جس انداز سے نئی مسلم لیگ کی ترتیبِ عمل میں لائی گئی ہے اس کی تفاصیل کا ذکر آپ نے غالباً مصلحتاً نہیں کیا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان تفاصیل کی مدد کے بغیر آپ محولہ حقائق اخذ نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں، میں اپنے مشاہدات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ قارئین طلوعِ اسلام کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض خیالی اور تصوری ہے۔

پاکستان مسلم لیگ کے ناظم (حال صدر) نے جو اوقات نامہ سال گذشتہ پیش کیا تھا اس کے مطابق ہمارے شہر میں آئینی طور پر لیگ کی جماعت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ابتدائی ارکان کے اندراج کی جو آخری تاریخ مقرر کی گئی تھی اس تک ہمارے ہاں ایک رکن بھی بھرتی نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مقامی لیگ کے کارکن "دوسرے مشاغل" میں لگے ہوئے تھے۔ مقررہ تاریخ کے بعد رکن بننے والے لیگ کے انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن آپ یہ سُن کر متعجب ہوں گے کہ ہمارے شہر میں ایک نہیں بلکہ دو لیگیں قائم ہیں اور دونوں کے پاس مختلف ذمہ دار افسرانِ لیگ کی اسناد موجود ہیں۔ تاریخ مقررہ کے بعد رکن بھرتی کئے گئے اور رسیدات پر تاریخ پہلے کی درج کی گئی۔ یہ جعل سازی اس طرح ظاہر ہوئی کہ ایک رسید پر رکن بننے والے نے اپنے دستخط کرتے وقت اصلی تاریخ بھی لکھ دی۔ اسی رسید پر سکرٹری صاحب نے اپنے دستخطوں کے نیچے جو تاریخ لکھی وہ اصلی تاریخ سے مختلف، پچھلے ماہ کی تھی۔ یہ جعل سازی ضلع لیگ کے علم میں آئی۔ اُسوقت کی ضلع لیگ کے ایک ذمہ دار عہدیدار نے خود مجھ سے اس بے ضابطگی کا ذکر کیا اور میرے استفسار پر کہا کہ . . . . . میں آئینی رُو سے لیگ کا وجود ہی نہیں۔

اسی ذمہ دار عہدیدار اور صوبہ لیگ کے بھیجے ہوئے ایک افسرِ انتخاب کی موجودگی میں ہماری لیگ کا انتخاب ہوا۔ مختلف امیدوار اپنے اپنے حامیوں کو جمع کرتے رہے۔ جن امیدواروں نے قبل از وقت اپنے آدمی جمع کر رکھے تھے انھوں نے اپنے حریفوں کی تاخیری کوششوں کی تکمیل سے پہلے ہی انتخاب جیت لیا۔ اتفاق سے ان منتخب شدہ ارکان میں ضلع لیگ کے مذکورہ ذمہ دار بزرگ کا کوئی آدمی شامل نہ تھا۔ انھوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ کر ایک نیا فیصلہ صادر فرما دیا۔ انھوں نے اعلان یہ کیا کہ چونکہ . . . کی لیگ میں جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے متحارب گروہوں میں مصالحت کی غرض سے فلاں صاحب کو صدر اور پہلے منتخب شدہ صدر کو ان کا نائب مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ فلاں صاحب بزرگ مذکور کے ہمنوا ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات "ایک" لیگ کے صدر ہیں۔ شہر کے مسلمان لازماً دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ "خدمتِ ملت" کون سا صدر کر رہا ہے اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

جنگِ پاکستان کے دوران میں جب لیگ کی عہدیداری پُرخطر تھی ہمیں ضروری عہدیداروں کیلئے بھی آدمی نہیں ملتے تھے خود راقم الحروف بیک وقت کئی عہدیداروں کا کام تنہا کرتا رہا ہے۔ اور اب جبکہ سیاسی زندگی "زرخیز" ہو گئی ہے ہمارے پاس اتنے "اہل" آدمی موجود ہیں کہ ایک شہر میں دو لیگوں میں ہی دو درجن کے قریب عہدے پُر کرنے کے بعد بھی کئی حضرات ایسے ہیں جو "خدمت" کے ان مواقع سے محروم رہ گئے ہیں۔

ضلع لیگ کے انتخابات میں ضلع کے مذکورہ عہدیدار کو خلافِ توقع شکست ہو گئی اور سارے عہدیدار ایسے حضرات منتخب ہوئے جو ان کے مخالف تھے۔ ضلع لیگ کے علاوہ ضلع کے صدر مقام کی شہری لیگ اور چھاؤنی لیگ پر بھی ان کے مخالفین کا قبضہ ہو گیا۔ اب شکست خوردہ عہدیدار اپیل لے کر صوبہ کے انتخابی بورڈ کے پاس لاہور پہنچے۔ فاتح گروہ کی آئینی حیثیت مضبوط تھی۔ انھوں نے اپنے حق بجانب ہونے کے متعلق انتخابی بورڈ کو یقین دلا دیا لیکن بورڈ کے ایک رکن نے اعتراف کیا کہ وہ مجبور ہیں (یعنی مجبور کئے گئے ہیں) کہ وہ فاتح گروہ کے خلاف فیصلہ دیں۔ اس رکن نے مزید کہا کہ انھیں ایک ایک لیگ کو معطل کرنا پڑے گا۔ اس مجبوری کی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ ضلع لیگ جس گروہ کے قبضہ میں آ گئی تھی وہ وزارتِ وقت کے خلاف تھا۔ اس گروہ کا سالار وزارت کے مخالف گروہ کا ممتاز رکن تھا۔ ضلع لیگ پر ان لوگوں کے مسلط رہنے سے وزارت کے مخالف گروہ کیلئے صوبائی لیگ کی صدارت تک پہنچنا سہل ہو جاتا تھا۔ حکومت پر فائز طبقہ اس امکان کو کم کرنا کرانا چاہتا تھا ——— فاتح گروہ پاکستان لیگ کے ناظم کے پاس پہنچا۔ الیکشن بورڈ چھاؤنی لیگ کو معطل کر کے ضلع لیگ کے خلاف اپیل ناظم کے پاس بھیج چکا تھا۔ ناظم نے تمام حالات سن کر اپیل مسترد کر دی اور ضلع لیگ کو بحال رکھا۔ جب یہ فتحمند گروہ دوسری بار فتحیاب ہو کر کراچی سے لاہور پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ ناظم نے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی ہے کہ ان کے پہلے فیصلہ کو منسوخ سمجھا جائے اور ضلع . . . کی لیگ کو معطل کر دیا جائے ——— اسی معطل ضلع کے کونسلروں کی شمولیت پر صوبہ لیگ کونسل کے اجلاس میں کرسی آزمائی کا مظاہرہ ہوا تھا۔ اس عرصہ میں صوبہ لیگ کی صدارت مخالفِ وزارت گروہ کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ نئے صدر نے برسرِ مسند آتے ہی متنازعہ ضلع لیگ کو بحال کر دیا جسے ناظم معطل کر چکے تھے۔ نئے صدر نے اپنے اس اقدام کے جواز میں یہ کہا کہ صوبہ میں باقاعدہ لیگ منظم ہو چکنے کے بعد ناظم کا کوئی اختیار نہیں رہ جاتا۔

اب ضلع کے شکست خوردہ عہدیدار یہ کہتے ہیں کہ ناظم، ضلع کی لیگ کو معطل کر چکے ہیں اور فریقِ مخالف یہ کہتا ہے کہ اس تعطل کو صوبہ لیگ کے صدر صاحب جائز طور پر دور کر چکے ہیں۔ گویا ہمارے شہر کی طرح ضلع میں بھی دو لیگیں ہیں یعنی کوئی لیگ بھی نہیں۔

سیاست کے اس عجیب و غریب کھیل میں اور کون کون سے اداکاروں نے پارٹ ادا کیا؟ اس قصے کو نہ چھیڑیئے۔ اس آئینہ میں اس ساری تنظیم کا عکس دیکھئے جو پاکستان کے استحکام کیلئے ضروری سمجھی گئی ہے۔

دربارِ نبیؐ

تیری آنکھوں کے نہ کھلنے سے ہے یہ تیرہ شبی
ورنہ محدود نہیں روشنیٔ دینِ نبیؐ

چشمِ عالم کے لئے باعثِ حیرانی ہے
عین دریا کے کنارے پہ تری تشنہ لبی

اپنی تقدیر سے مایوس ہو کیوں وہ اُمت
آج تک جو کسی طاقت کے دبائے نہ دبی

وسعتِ ارض و سما محفلِ لولاک لما
ہے جلو خانۂ دربارِ رسولِ عربی

ایسے دربار میں اغیار بھی بیکار نہیں
دین کا حسن بڑھاتی ہے یہاں بولہبی

یہ تو سچ ہے کہ فرشتوں کی نہیں کوئی کمی
لیکن اُمت ہی سے ہے رونقِ دربارِ نبیؐ

جب ہے دربار کی شوکت کو بڑھانا مقصود
بے بسی کا بھی کریں عذر تو ہے بے ادبی

وقت کرتا ہے یہ اعلان مسلمانوں میں
آج دربارِ نبیؐ میں ہے تمہاری طلبی

تیغ زن حاصلِ شمشیرِ دودم پیش کرے
اور قلم کش اثرِ زورِ قلم پیش کرے

رہرو تیز قدم سعیٔ قدم پیش کرے
قوم کا راہنما قوم کا غم پیش کرے

خیمہ دربارِ رسالت کا کرے نصب عرب
اس کی تزئین کا سامان عجم پیش کرے

جس کو اللہ نے تقریر کی قوت بخشی
دلکش انداز میں مقصودِ حرم پیش کرے

صوفیٔ پاک نظر عشق کا تحفہ لائے
فلسفی دین کے اسرار و حکم پیش کرے

نوجواں جوششِ عمل اور اطاعت دکھلائے
دلِ پُر ولولہ و گردنِ خم پیش کرے

زیرِ دست اپنی دعاؤں کی دکھائے تاثیر
اور زبردست مداوائے ستم پیش کرے

آئے اور نذر کرے ہدیۂ محنت مزدور
جو ہے زردار وہ دینار و درم پیش کرے

ہے تہی دست اگر شاعرِ بے برگ و نوا
جگرِ سوختہ و دیدۂ نم پیش کرے

جس قدر مایہ بھی ہے دامنِ اُمت میں اسدؔ
ہے سبھی کچھ جو بیک وقت وہ ہم پیش کرے

اسدؔ ملتانی

وراثتِ ارض کا ابدی قانون

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظامِ کائنات ایک معین قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرۂ خاک کو لیکر بڑے سے بڑے کرۂ سماوی تک ہر شے زندانیٔ تقدیر ہے۔ آفتابِ جہانتاب ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق ہر صبح دریچۂ مشرق سے جھانکتا ہے اور ایک متعینہ شاہراہ پر چل کر ہر شام حجلۂ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کے دورانِ سفر میں ہر شے جس میں زندگی کی صلاحیت ہوتی ہے اس کے نور و حرارت سے اپنے سینے کو بھرپور کر لیتی ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶/۳۸) چاند ایک خاص قاعدہ کے مطابق، ایک غوطہ خور کشتی سیمیں کی طرح صبائے نیل سے ابھرتا ہے اور ایک خاص نظام کے تابع پھیلتا اور سمٹتا، پھر کسی کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶/۳۹) جب خزاں کی دست درازیاں صحنِ گلستاں سے شگفتگی و شادابی کے تمام آثار و مظاہر کو، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے متاعِ حیات کی طرح ختم کر دیتی ہیں تو فطرت کے ایک معینہ قاعدہ کے مطابق، نسیمِ بہار مسرتوں اور شادمانیوں کی ایک رنگین و عطر آگیں دنیا اپنے جلو میں لئے آتی ہے، اور زمین کے حسرت زدہ، غم آلود چہرے کو پھر سے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتی ہے۔ وَ كَذَٰلِكَ اللّٰهُ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا [illegible] وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ (۳۶/۳۴)

پھر جس طرح یہ قوانین و ضوابط خارجی دنیا میں جاری و ساری ہیں اسی طرح انسان کی داخلی دنیا میں بھی ان کی حکمرانی ہے اور جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کی جوئے رواں ان ہی سواحل میں محصور ہے اسی طرح اس کی حیاتِ اجتماعیہ کا یمِ بیکراں بھی ان ہی حدود و ثغور میں مقید۔ انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں

حسبِ منشا بہترین نظامِ حکومت اور آئینِ مملکت ہے جسے قرآن "وراثتِ ارض" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کسے ملتی ہے اور کس طرح ملتی ہے؟ اور پھر کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کے لئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون معین ہے اور وہ قانون، قرآن کے ان الفاظ میں مشہود ہے جو سورۃ انبیاء میں یوں مرقوم ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ (۲۱/۱۰۵-۱۰۶)

"اور ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے صالح بندوں کے لئے مقدر ہے (اس عظیم الشان قانونِ خداوندی میں) عبودیت اختیار کرنے والی قوم کے لئے ایک عظیم القدر بصیرت افروز حقیقت کا پیغام ہے۔"

امانتِ حکومت و مملکت کی تفویض اور مناصبِ جہانداری و جہانبانی کی وراثت کے متعلق یہ وہ قانونِ ابدی اور اصولِ سرمدی ہے، جس کا نوشتۂ خداوندی کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال اور ان کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لئے پیغامِ عظیم اور بلاغِ مبین مضمر ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہے؟ یہی کہ وراثتِ ارض کے لئے صلاحیت (یا صالحیت) شرط ہے۔ یعنی وہی قانون جو عالمِ آفاق میں بقاء للاصلح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری و ساری ہے۔

"صالح" دیکھنے کو تو چار حروف کا ایک مختصر سا لفظ ہے، لیکن اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایسا ہمہ گیر ہے کہ اس میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں۔ صالح کے معنی صحیح و سالم، تندرست، توانا، مستوی الجسم اور متناسب الاعضاء، زندگی کی تمام صلاحیتوں کو لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ جنین کی پیدائش سے پہلے، میاں بیوی دونوں خدا سے دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ (۷/۱۸۹) خدایا! ہمیں صحیح و سالم، تندرست و توانا بچہ عطا کر دے تاکہ ہم تیرے شکر گزار بنیں — فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا (۷/۱۹۰) لیکن جب اللہ انہیں تندرست و توانا بچہ عطا کر دیتا ہے

اس باب میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک بنانے لگ جاتے ہیں) اس جگہ صحیح و سالم اور تندرست و توانا بچے کے لئے صَالِحًا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اس کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریا کے ہاں اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اس کے لئے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی رفیقۂ حیات کو جو عقیم تھیں، اولاد کے قابل بنا دیا۔ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (۲۱/۹۰) لہٰذا اصلاح کے معنی ان قابلیتوں اور استعدادوں کو پیدا ہونا ہے جن سے عمدہ نتائج مرتب ہوں۔ ان ہی معنوں میں یہ لفظ سورۂ النور میں استعمال ہوا ہے جہاں فرمایا کہ تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے (جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں موجود تھے) جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ (وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۲۴/۳۲) ان کے نکاح کر دو۔

ان آیات سے صلاح و صالح کے معانی ہمارے سامنے آگئے جن سے واضح ہو گیا کہ اس قانونِ سرمدی کی رو سے جو ہمارے موضوع کا محور اور اس زندگی بخش داستان کا زیبِ عنوان ہے، زمین کی وراثت (حکومت و مملکت) کے مستحق وہی ہوں گے جو اس کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوں جن میں زندگی اور اس کی توانائیاں تڑپ رہی ہوں۔ جن کے سینوں میں دم، جگر میں خون، بازوؤں میں قوت، پاؤں میں استقامت، ذہنوں میں جلا، نگاہوں میں روشنی، ارادوں میں بلندی اور عزائم میں پختگی ہو جو دنیا میں حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں اور پھر اس تمنا کی تکمیل اور اس آرزو کے حصول کے لئے ایسی قوت فراہم کریں کہ جو قوم ان کے عزائم کی راہ میں مزاحم ہو اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں۔ دنیا میں جن کے پاس قوت نہیں اس کا کوئی دعویٰ بھی سچا نہیں۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو اپنی قوت بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ قانون جس کے پیچھے قوت نافذہ نہ ہو، وعظ اور اپدیش بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اس قانون کے ساتھ، جسے دنیا میں دین کی حیثیت سے مستحکم و متمکن رہنا مقصود ہو، فولاد کی شمشیر جگردار کی بھی ضرورت ہے

یہی وہ ضوابط قانون ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ ان کے ساتھ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ (۵۷/۲۵) ہم نے ضوابط دین اور میزانِ عدل کے ساتھ فولاد بھی نازل کیا جس میں بڑی شدت کی سختی ہوتی ہے۔ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) تاکہ لوگ جادۂ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

ایں دو قوت حافظ یک دیگراند

کائناتِ زندگی را محور اند

یہی وہ قوت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ :-

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ

عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)

جس قدر قوت کے سازو سامان اور گھوڑوں کے پرے باندھ رکھنے کی تم میں استطاعت ہو وہ تم

اللہ اور اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رکھو۔

قوت اور رباط الخیل کی ماہیت میں تمام سامان و آلاتِ حرب و ضرب، سازو یراق جنگ و جدل اور وسائل و اسباب مدافعت و محاربت شامل ہیں۔ زمانہ کے مقتضیات اور احوال و ظروف کے تبدل و تغیر سے ان اسباب و ذرائع کی نوعیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن قوت کی وہ روح جو زندگی کی اصل ہے، ہر جگہ بدستور قائم رہے گی۔ گو پتے کے پتھر سے کر ایٹم بم کے گولے تک، ایک ہی روح کے مظاہر، ایک ہی اصل کی شاخیں، ایک ہی جان کے پیکر اور ایک ہی تلوار کی نیام ہیں۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان پیکروں کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ جس قوت کی نوعیتیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں، وہ قوت معاف زندگی میں، اسی طرح پیچھے رہ جاتی ہے جس طرح فلک پیما طیارے کے مقابلہ میں "راجہ جی کی بہلی"۔

ہاں تو! دنیا میں زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہو۔ آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استطاعت ہو۔ لہٰذا حکومت و مملکت اسی کی تقدیر میں ہوتی ہے جس میں جہانبانی و جہانداری کی صلاحیتیں اور خسروی اور سر آرائی کی قابلیتیں ہوں۔ ہر قوم

هٰذا البلٰغا لقوم عابدین۔

یہاں تک صالحیت کا صرف ایک گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے جس کا نام مادی قوت (Physical power) ہے۔ لیکن قرآن کی روسے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہوجاتی۔ اس میں تو کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان کی کچھ تفریق نہیں۔ جو بھی مادی قوت حاصل کرلے، وہ غلبہ و استیلا حاصل کرسکتا ہے اور اس طرح صاحبِ حکومت و سلطنت بن سکتا ہے۔ آج دنیا میں جدھر نگاہ ڈالئے ان ہی مادی قوتوں کا باہمی مقابلہ نظر آئے گا۔ جس کے پاس قوت اور اس سے حاصل کردہ سامان و ذرائع زیادہ ہیں، وہی سب سے بڑی سلطنت و حکومت کا مالک ہے۔ اور یہ صرف آج ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے، ہر صفحہ پر یہی حقیقت فولاد کے ابھرے ہوئے الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی۔

لیکن، جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، قرآن کی روسے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہوجاتی اور صرف اس کے زور پر قائم کردہ غلبہ و استیلا اور تسلط و تمکن سے اصلاح نہیں پیدا ہوتی۔ اس نے بتایا ہے کہ اصلاح و فساد، دو الگ الگ نتائج ہیں، جو ایک دوسرے کی ضد و نقیض ہیں۔ جو نظامِ سلطنت فقط مادی قوتوں کے استیلا پر قائم ہوتا ہے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ سورہ شعراء میں دیکھئے اس حقیقت کو کس قدر واضح طور پر بے نقاب کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ:۔

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۶/۱۵۲)

حدود فراموش سرکش قوتوں کے نظام کی اطاعت مت کرو۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، اصلاح نہیں کرتے۔

سورہ نمل میں اسی ضمن (قصہ حضرت صالحؑ) میں ارشاد ہے کہ۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۷/۴۸)

اور اس شہر میں نو اکابر ارکانِ سلطنت تھے جو ملک میں فساد برپا کر رہے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق قرآن کی ابتدائی آیات میں کہا گیا ہے کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ (۲/۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن نے ان چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھدیا ہے۔ عہدِ قدیم کے نماردہ و فراعنہ سے لے کر عصرِ حاضر کے "ہٹلران دہر چلان" میں سے کسی سے پوچھئے۔ ہر پیکرِ فساد و استبداد یہی کہیگا کہ ہماری غرض اصلاح ہے، مفسدین تو دوسرے ہیں۔ گذشتہ جنگ عمومی میں ہر فریقِ متخاصم کی زبان پر یہی تھا کہ ہم حق و صداقت اور عدل و انصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اب بھی مغربی بساطِ سیاست کے ہر مہرہ باز کا یہی اعلان ہے کہ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ لیکن قرآن کی رو سے ہر وہ نظام جو ذاتی اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے قوت کے زور پر قائم کیا جاتا ہے، باطل کا نظام ہے جس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ اصلاح صرف اس نظام کا نتیجہ ہے جس میں قوت کا استعمال آئینِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج کے لئے ہوتا ہے۔ اس نظام کا فطری نتیجہ عدل ہوتا ہے اور عدل سے مفہوم ہے ایسی فضا جس میں ہر شخص کی فطری صلاحیتوں کے ابھرنے، نشوونما پانے اور تکمیل تک پہنچنے کے لئے یکساں مواقع میسر ہوں۔ شرفِ انسانیت اسی نظام میں، ارتقائی منازل طے کر کے اپنی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔

گر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ محکومیت و اطاعت صرف احکامِ خداوندی کی ہوگی اور جس جماعت کے ہاتھوں اُن احکام کی تنفیذ ہوگی وہ اپنے ہر قول و فعل کے لئے اپنے خدا کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔ اس ایمان کی بنیاد پر جو عمارت قائم ہوگی اس کا نام عملِ صالح ہے اور ان دونوں کا نتیجہ استخلاف فی الارض۔ یہی وہ استخلاف (وراثتِ ارض) ہے جس کے لئے صالحیت کی شرط ہے۔ یا یوں کہئے کہ جب اور جہاں اس قسم کی صالحیت پیدا ہوئی، وراثتِ ارض اس کا فطری نتیجہ ہوئی۔ اسی کا نام "اللہ کا وعدہ" ہے جس کا ذکر سورۂ نور کی ان درخشندہ آیات میں کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)

اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان لائیں گے اور صالح العمل ہوں گے انہیں اللہ زمین میں حکومت عطا کرے گا۔ جس طرح ان شرائط کے پورا کرنے والوں کو اس سے قبل، وراثتِ ارض کی نعمتوں سے مالا مال کیا گیا۔

یہ استخلاف (وراثتِ ارض) کس غرض کے لئے ہوگی؟ لِيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴/۵۵) تاکہ وہ نظام نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا جائے جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (۲۴/۵۵) تاکہ ان کی حالتِ خوف کو کامل امن و سکون سے بدل دیا جائے اور ---- يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (۲۴/۵۵) یہ صرف قوانینِ الٰہیہ کے مطیع و محکوم ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت ان سے اپنی حاکمیت نہ منوا سکے۔

یہ ہے وہ استخلاف (حکومت) جو وراثتِ ارض سے متعلق اس قانونِ سرمدی کی رو سے حاصل ہوتی ہے جو ہمارے پیشِ نظر موضوع کا عمود ہے۔

لیکن اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کا صحیح جواب سامنے نہ آئے تو اصلاح اور فساد کا فرق نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور انسان تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صالحیت کی اس شرط کو پورا کرنے سے جو حکومت و مملکت عطا ہوتی ہے، وہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ تو جو حکومت و سلطنت فقط مادی قوتوں کے زور سے حاصل کی جاتی ہے، وہ کیا خدا کی طرف سے نہیں ہوتی؟ اسے کون دیتا ہے؟

اگر آپ غور دیکھیں گے تو اس سوال کے ڈانڈے مسئلہ تقدیر سے جا ملیں گے۔ مسئلہ تقدیر کی بحث بڑی تفصیل طلب[۱] ہے اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ جس انداز سے یہ مسئلہ عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اور جس کی وجہ سے یہ قوم

---

۱ اس کی تفصیلی بحث کے لئے معارف القرآن جلد اول دیکھئے۔

گذشتہ ایک ہزار برس سے راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، اس سوال کا محرک بھی وہی ہے۔ تقدیر کا یہ مفہوم جو امیہ کے زمانہ کی تخلیق ہے جسے انھوں نے اپنی ملوکیت کے استبداد کے "شرعی جواز" کی غرض سے وضع کیا اور پھر سیاسی حیلہ کاریوں سے اس طرح پھیلایا کہ یہ ایک حقیقت ثابتہ بن کر امت کے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا اور وہاں سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دولت اور قوت، حکومت و سطوت فی ذاتہٖ "خدا کی نعمت" اور اس کی "عطا فرمودہ" قرار پا چکی ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ دولت و قوت کس طریق سے حاصل کی گئی ہے اور اسے کس مصرف میں لایا جا رہا ہے؟ ہم جس دولتمند کا ذکر کرتے ہیں، بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ اس پر "اللہ کا بڑا فضل" ہے۔ ہر صاحب شوکت و سطوت کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ "یہ اللہ کی دین" ہے۔ اس غیر محسوس عقیدہ کی رو سے ہمارے نزدیک "دولت" خدا کی نعمت ہے خواہ وہ کسی نے ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو یا بطریق طیب۔ ہمارے ان قدیمی تصورات کی رو سے "حکومت" اللہ کا انعام ہے خواہ اسے انہی تغلب اور طاغوتی سیاست کے بل بوتے پر قائم رکھا ہو یا ایمان و عمل صالحہ کی بنا پر۔ غور کیجئے! ہماری زبان میں "اللہ کی دین" کے مقابلہ میں کسی اور کی دین کے لئے کوئی اصطلاح ہی موجود نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک ڈاکو کو بھی خدا دیتا ہے اور ایک مرد کاسب کو بھی۔ لہٰذا طاغوتی قوتوں کی حکومت بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور [illegible] کے قانونِ وراثت (یرثھا عبادی الصالحون) کے تابع۔ اور اسی بنا پر صالحون کے معنی ہو جاتے ہیں ہر وہ قانون جو حکومت قائم کرنے کی قوت پیدا کر لے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر فرعون کی حکومت بھی اسی قانونِ خداوندی کی رو سے ملی تھی تو حضرت موسیٰؑ کو اس کے خلاف اتنی بڑی مہم کے لئے کیوں مامور کیا گیا تھا؟ اگر باطل کا دولتی نظام بھی اسی ابدی قانونِ وراثت کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنے کے لئے اس قدر سرفروشیوں اور جاں سپاریوں کی تاکید کیوں کی جاتی ہے؟ حق و باطل کی یہ کشاکش و پیکار تو اسی بنا پر ہے کہ ان میں سے ایک (باطل) منجانب اللہ نہیں ہوتا۔ اگر قانونِ وراثتِ ارض صرف حصولِ قوت ہی کا دوسرا نام ہے تو اس کے لئے عرشِ عظیم سے آنے والے ہدایات کی کیا ضرورت ہے۔ اسے تو دنیا کا ہر ہلاکو اور ہر چنگیز خاں از خود جانتا ہے۔ اگر نیٹشے کا مافوق البشر، قرآن کا مردِ مومن،

تو پھر حکمت فرعونی اور حکمت کلیمی میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ خالص قوت کی بنا پر جو نظام حکومت قائم کر لیا جاتا ہے اسے خدا کے متعین فرمودہ قانونِ وراثت کا نتیجہ اور فلہٰذا من جانب اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ من جانب اللہ استخلاف فی الارض وہی ہوتا ہے جو اس کے قانونِ سرمدی کا نتیجہ اور قرآنی صالحیت کا ثمرہ ہو۔ اور یہی وہ استخلاف ہے جو ہمارے موضوع کا عنوان ہے۔ اور اسی سے مسلمان کو سروکار ہونا چاہیے۔

صالحیت کا قرآنی مفہوم متعین کرنے کے بعد اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ وراثتِ ارض (یعنی قوانینِ الٰہیہ کے مطابق حکومت قائم کرنے) سے پہلے، عام طور پر قوم کی حالت یا تو یہ ہوگی کہ اُن پر کسی دوسرے کی حکومت نہیں ہوگی۔ یعنی یا تو ان کی اپنی حکومت ہوگی۔ لیکن اسی غلبہ و تسلط کے آئین کے مطابق جس کی رو سے عام انسانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں، یا سرے سے کسی دولتی نظام کا وجود ہی نہ ہوگا اور قوم قبائلی قسم کی زندگی بسر کر رہی ہوگی۔ یا دوسری صورت میں قوم کسی مستبد حکومت کی محکوم ہوگی۔ اول الذکر صورت میں (یعنی جب حکومت اپنی ہو یا سرے سے کسی منظم حکومت کا وجود ہی نہ ہو) اس قوم کو اس امر کی امکانی قدرت حاصل ہوگی کہ وہ چاہے تو اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے آئینِ فطرت کے مطابق وراثتِ ارض کی دولت سے متمتع ہو جائے۔ اس صورت میں مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو اس انداز کے حکومت کے قیام میں اپنی ذاتی اغراض کا نقصان و زیان سمجھتے ہوں اور اس لئے اس تحریک کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ قوم یا تو فریقِ مخالف پر غلبہ حاصل کر لے گی اور اگر اس کا فوری امکان نہ ہوگا تو کسی اور خطۂ ارض کی طرف ہجرت کر کے اسے اس آئینِ حکومت کی قرارگاہ بنا لے گی۔ یہ وراثتِ ارض فطری نتیجہ ہوگی ان کی صالحیت کا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے وقت، قوم مخاطب کی یہی حالت تھی۔ عرب کسی غیر حکومت کے تابع نہیں تھے۔ قبائلی زندگی بسر کرتے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے تھے۔ اس لئے انھیں امکانی قدرت حاصل تھی کہ وہ چاہتے تو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں

پیدا کر کے وراثت ارضی کے مستحق بن جاتے۔ نبی اکرمؐ کی بصیرت افروز تعلیم اور حقیقت کشا عمل سے اس قوم نے وہ تربیت حاصل کر لی جس سے ان کے خفتہ جوہر بیدار ہو گئے اور وہ قوم اصلح بن کر استخلاف فی الارض کے مقام محمود تک پہنچ گئی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یہ خدا کے عدل کا مظاہرہ تھا۔

دوسری صورت کی مثال ہمارے سامنے قوم بنی اسرائیل کی ہے جو دعوتِ حضرت موسیٰؑ کے وقت فرعونِ مصر کے پنجۂ قہرمانیت میں گرفتار تھی جسے قرآن نے سوء العذاب اور بلاءٌ عظیم کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ ان پر فرعونی حکومت کے مستبد قوانین مسلط تھے اس لئے وہاں رہتے ہوئے انھیں اس امر کی امکانی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے جوہر خوابیدہ کو بیدار کر کے ان میں نمو و بالیدگی پیدا کر سکیں۔ اس کے لئے آزاد فضا کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ یعنی بالفاظِ دیگر صورت یہ پیدا ہو چکی تھی کہ

(۱) جب تک وہ اپنے اندر صلاحیت نہ پیدا کر لیں، آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

(۲) لیکن صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک وہ فرعون کے پنجۂ استبداد سے آزاد نہ ہو جائیں۔

عدل کی رو سے انھیں ہمیشہ کے لئے فراعنہ کی غلامی میں رہنا چاہیے تھا۔ لیکن خدا کے ہاں عدل کے ساتھ احسان بھی ہے۔ احسان کا تقاضا تھا کہ انھیں اس مستبد حکومت کی غلامی سے نجات دلا کر وہ امکانی قدرت عطا کر دی جاتی (یعنی ایسے مواقع پیدا کر دیئے جاتے) جس سے وہ اپنے اندر صلاحیت پیدا کر کے وراثتِ ارض کی نعمتِ عظمیٰ کے مستحق بن جاتے۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جسے قرآن نے ان درخشندہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً
وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ (۲۸/۵)

اور ہم نے چاہا کہ وہ لوگ جنھیں ملک میں (غلامی و محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر) بیحد کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں۔ اور انھیں امام (قوموں کی قیادت کرنے والے) بنائیں۔ اور انھیں

(حکومت و مملکت کا) وارث بنائیں اور (اس طرح) انہیں زمین میں متمکن کر دیں۔

لہٰذا انہیں فرعون کی غلامی سے نجات، بطور انعام موہبت کر دی گئی اور انہیں یمن کی وادیوں میں پہنچا دیا گیا جہاں ان پر کسی غیر کی حکومت نہ تھی اور اس طرح ان کے لئے ایسی امکانی قدرت پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تربیت دے کر وراثتِ ارض کے مستحق بن جائیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان بالکل اسی طرح ملا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وراثتِ ارض یا استخلاف ہے، وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وراثتِ ارض بلا مزدو معاوضہ نہیں ملا کرتی۔ وہ فطری نتیجہ ہوتی ہے صالحیت کا، اور صالحیت ایمان اور اعمالِ صالحہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ انعاماً اور احساناً صرف غیروں کی غلامی سے رستگاری عطا ہوتی ہے تاکہ اس سے صالحیت پیدا کرنے کی امکانی قدرت نصیب ہو جائے۔ ہمیں اس وقت صرف ایک خطۂ زمین ملا ہے جس پر کسی کی حکومت نہیں۔ اب ہم چاہیں تو

(۱) اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس زمین پر خدائی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھا دیں۔

(۲) صرف مادی قوتوں کے زور سے غلبہ و استیلا پیدا کر کے اسی قسم کی سلطنت تشکیل کر لیں جس قسم کی سلطنتیں دوسری طاغوتی قوتوں نے قائم کر رکھی ہیں۔ اور یا

(۳) موجودہ جمود و تعطل اور بے عملی اور بے حسی کی زندگی سے اس امکانی قدرت کو بھی کھو بیٹھیں اور پھر کسی اور کی غلامی سے بدستور سابق جہنم کی لعنتی زندگی میں گرفتار ہو جائیں۔

ہم نے کہا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسی اس وقت بنی اسرائیل کی تھی۔ اب آیئے دیکھیں کہ اس حالت میں بنی اسرائیل نے کیا کیا۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وَفِيهَا بَصَائِرُ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

بنی اسرائیل کو اللہ کی اس موہبت عظمیٰ پر قدم قدم پر تشکر و امتنان کے سجدے کرنے چاہئیں تھے۔ یہ انعام کچھ چھوٹا انعام، اور یہ احسان کچھ کم احسان نہ تھا۔ فرعون جیسے مجسمہ استبداد و قہر مانیت کے دست جور و ستم سے رستگاری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن صدیوں کی غلامی سے

بنی اسرائیل کے جوہرِ انسانیت قریب قریب مردہ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیلیں تھیں، نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقاصد کی تابناک درخشندگی۔ دنیا میں غلامی ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص جنہیں جوہرِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہئے، اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن اثرات کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے حقائق کے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح، اس عافیت کوشی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ

سنتے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

صدیوں کی غلامی سے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی اور سہل انگاری کی افسردگی ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور وہ اس نہج زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلِ احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ حضرت موسیٰ انہیں بار بار تاکید کرتے تھے کہ ذرا ہمت اور استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ۔ انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔ ذرا اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لو۔ وراثتِ ارض تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۷/۱۲۸)

تب موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا، خدا سے مدد مانگو اور (اس راہ میں)

بیٹھے رہو۔ بلاشبہ زمین (کی بادشاہت) صرف خدا کے لئے ہے۔ وہ اپنے بندوں میں کو جسے چاہتا ہے اپنے قانون مشیت کے مطابق اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام کار انہی کے لئے ہے جو متقی ہوئے۔

لیکن اس تذکیر و تنذیر سے ان پیکران آب و گل کی رگوں میں خون زندگی دوڑانا آسان نہ تھا۔ حضرت موسیٰ انھیں عزم و استقلال کے لئے ابھارتے اور وہ شکوہ سنج ہوتے کہ "تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں رہے اور اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ہم سمجھے تھے کہ اب آرام سے گذرے گی لیکن تم تو نت نئے دن ایک نیا مرحلہ سامنے لے آتے ہو تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے۔

قَالُوٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۷/۱۲۹)

انھوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچ رہی تھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا۔ قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں استخلاف فی الارض عطا فرما دے۔ پھر دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو!

لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر تک محکومیت کے جراثیم گھر کر چکے ہوں، جو قرنوں غلامی میں پختہ ہو چکے ہوں ان پر بھلا ان حیات آور خطبات اور زندگی بخش پیغامات کا کیا اثر ہو؟ جب حضرت موسیٰ انھیں مصر سے نکال کر لے چلے ہیں تو وہ اس طرح پا بجولاں جا رہے تھے جیسے کہیں بیگار میں پکڑے جا رہے ہوں۔ جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے اور پیچھے سے فرعون کا لشکر تعاقب میں آیا تو انھوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل کر لے آئے ہو؟

فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ (۲۶/۶۱)

جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً (پھر) قابو آ گئے۔

تورات میں ہے۔

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اٹھا کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰؑ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔ (خروج ۱۴-۱۰-۱۲)

غور کیجئے! غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک کر باہر آ رہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مصریوں کی خدمت گذاری اس سے کہیں بہتر تھی۔ اس سے بڑی بدبختی اور کس کی ہوگی جو قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے کہ آشیانہ میں کہیں خوفِ برق ہے کہیں خطرۂ صرصر۔ کبھی فکرِ معاش ہے اور کبھی خدشۂ صیاد۔ قفس کی زندگی میں یہ تمام تفکرات و خدشات آقا کے ذمہ تھے۔ اللہ اکبر! "حکمراں کی ساحری" بھی کس درجہ کامیاب ہوتی ہے جو انسان کی فطرت بدل دیتی ہے وہ فطرتِ صحیحہ جو انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ خطرہ نہیں، بلکہ خطرہ کا تصور بھی اسے مرگِ ناگہانی بن کر دکھائی دیتا ہے۔ محکومیت کی افیون سے اس کے قوائے عملیہ اس درجہ مخدر ہو جاتے ہیں کہ جد و جہد اور سعی و کاوش کی زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ عافیت کوشی اور سہل انگاری سے کہ جس کے لئے حاکم قوم کی طرف سے خاص طور پر اسباب و ذرائع مہیا کئے جاتے ہیں، ان کی قوتِ برداشت بالکل سلب ہو جاتی ہے اور وہ بات بات پر جھلا اٹھتے ہیں۔ محکومیت کا زہر کس قدر میٹھا، خواب آور اور چپکے چپکے، غیر محسوس طور پر موت کی طرف لیجانے والا ہوتا ہے! یہی زہر تھا جو بنی اسرائیل کے خون کے ہر ذرہ میں سرایت کر چکا تھا اور انہیں ذرا سی تکلیف پر اس امر کا دلی تاسف ہوتا تھا کہ ہم مصر

کی حکومت سے کیوں آزاد ہو گئے! چنانچہ تورات میں دوسری جگہ ہے۔

> پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرہویں دن سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس میدان میں موسیٰؑ اور ہارون پر جھنجلائی۔ اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے مارے جاتے کیونکہ تم ہم کو اس بیابان سے نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کر دو۔ (خروج ۱۶/۱-۳)

آپ نے دیکھا ہے کہ انھیں کس چیز کی یاد ستا رہی تھی؟ "گوشت کی ہانڈیوں کی"! یعنی جیل خانے کی روٹیوں کی یاد! یا للعجب!! سحرِ حکمرانی کس قدر قلبِ ماہیت پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے دیدۂ شاہیں میں نگہ خفاش رکھدی جاتی ہے، جو جہنم کے شجرۃ الزقوم کو ثمرِ بہشت بنا کر دکھاتی ہے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ایک میدان میں پہنچے جہاں ذرا پانی کی قلت تھی تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟

> تب بنی اسرائیل کی جماعت نے رفیدیم میں ڈیرا ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ ہم پئیں۔ موسیٰؑ نے انھیں کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰؑ پر جھنجلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں کو اور ہماری مواشی کو پیاس سے ہلاک کر دے۔ (خروج ۱۷/۱-۳)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر روٹھ جاتے تھے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے؟ قرآن کریم نے اس قوم کی داستانِ زندگی کو جو اس طرح اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور

مختلف مقامات پر اُسے بار بار سامنے لاتا ہے تو اسی لئے کہ اس کے اندر ہر دیدۂ بینا کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ مدتوں کی غلامی سے قوموں کی کیا حالت ہو جاتی ہے؟ اس کا اندازہ لگانا ہو تو داستانِ بنی اسرائیل کو غور سے پڑھئے۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ کی وہ موہبت و نعمت جو انھیں بلا محنت و مشقت مل گئی تھی ان کے لئے وبالِ جان اور بلائے بے درمان بن رہی تھی۔

بخود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے
ہزاراں سال منزل در مقامِ آذری کردہ

انھیں مصر کی بعنتی زندگی سے نکال کر سینا کے میدانوں میں اس لئے لایا گیا کہ وہ اپنے جوہرِ خودی کی تربیت کریں اور اس طرح اپنے اندر ایسی فولادی سیرت پیدا کر لیں کہ وہ مصافِ زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ کر سکے اور یوں اپنے پیکرِ خاکی کے ذراتِ کہن کو ترکیب نو دے کر اس سے ایک جہانِ دیگر کی تعمیر کر لیں کہ جو وراثتِ ارض کی قرارگاہ پائے۔ لیکن ان کی جو حالت تھی وہ آپ کے سامنے ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم پر موسیٰ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور عجیب و غریب مطالبات پیش کرتے۔ سینا کی وادیوں سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بُت کی پوجا کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بُت بنوا دیجئے! قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ۔ (۷/۱۳۸) حتیٰ کہ حضرت موسیٰ جب چند روز کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے تو انھوں نے گوسالۂ سامری کی پرستش شروع کر دی۔ جب ان سے کہا گیا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً (۲/۵۵) "ہم کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں"۔ وادی ایمن میں صحرا کی صاف و سادہ غذا مائدۂ فطرت پر کھانے کو ملتی تھی۔ لیکن انھیں رہ رہ کر شہر کی "مسالہ دار" زندگی کی یاد ستاتی تھی۔ چند روز کے بعد منہ بسور کر بیٹھ گئے کہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ۔ (۲/۶۱) "ہم سے ہر روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جائے گی"۔

جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مضمحل اور ان کے جوہر مردانگی مسلوب ہوجاتے ہیں تو ان کے پاس فقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں، عمل کے بجائے شاعری شروع کر دیتی ہے۔ بات بات پر منطقی موشگافیاں، قدم قدم پر فلسفیانہ نکتہ آرائیاں۔ زندہ قوموں کا شیوۂ زندگی ہوتا ہے "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" سُنا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ وہ کام زیادہ کرتے اور باتیں بہت کم۔ لیکن محکوم قوم باتیں ہی باتیں کرتی ہے، کام بالکل نہیں کرتی۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی ان سے کہا گیا کہ ایک گائے ذبح کر لو۔ کس قدر صاف اور سیدھی بات تھی۔ لیکن سورۂ بقرہ کو اٹھا کر دیکھئے۔ انھوں نے اس پر بھی کتنی باتیں بنائی ہیں اور کس طرح بال کی کھال نکالنا شروع کی ہے۔ یہ ہوتی ہے محکوم کی ذہنیت!

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مصر سے خروج، بنی اسرائیل کے لئے مقصود بالذات نہ تھا۔ فرعون کی محکومیت سے رستگاری اس مقصد کے لئے ہوئی تھی کہ یہ قوم صحرائے سینا کی تربیت گاہ میں اپنے اندر صالحیت کے جوہر پیدا کرلے، تاکہ ارضِ مقدس (فلسطین) کی وراثت ان کے حصہ میں آجائے۔ حضرت موسیٰ انھیں سرزمینِ فلسطین کے کنارے تک لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ ہے وہ زمین جو تمہارے خدا نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور اس پر قبضہ کرلو۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۵:۲۱)

لوگو! اس مقدس سرزمین میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ عزم و ہمت کے ساتھ) داخل ہوجاؤ۔ اور اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف نہ ہٹو (کہ کامیاب ہونے کی بجائے) نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے۔

لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ سپاہیانہ عزم کے تصور سے ان پر رعشہ چھا رہا تھا۔ فریقِ مقابل کے آدمی انھیں دیو نظر آتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ (۵/۲۴)

لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسیٰؑ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بہت ہی زبردست ہیں (ہم میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں) جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے از خود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ فریق مقابل از خود وہاں سے نکل جائے۔ ہم پھر آگے بڑھیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے بہتیرا سمجھایا لیکن ان پر اس پند و موعظت کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (۵/۲۵)

وہ بولے۔ اے موسیٰؑ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں (اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی مصر ہو تو) تم خود چلے جاؤ اور تمہارا خدا بھی تمہارے ساتھ چلا جائے۔ تم دونوں وہاں ان کے ساتھ لڑنا (جب فتح ہو جائے ہمیں آواز دے لینا) ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

لیجئے! جواب مل گیا کہ ہماری یہودی کی ایسی ہی تڑپ ہے تو جائیے ان لوگوں سے لڑیئے اور اپنے ساتھ (معاذ اللہ) اپنے اس خدا کو بھی لے جائیے جس نے فتح و کامرانی کا وعدہ دے رکھا ہے۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔ جب دشمن مغلوب ہو جائے تو ہمیں آواز دے لینا ہم پہنچ جائیں گے۔

اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے غلام کی!!

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا وہ لوگ وراثت ارض کے مستحق بھی بلا محنت و مشقت ہو گئے؟ کیا انہیں وہ سرزمین یونہی اتفاقاً مل گئی! بالکل نہیں۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۗ فَلَا

تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ (جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے تو) اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سو اے موسیٰؑ تم ان نافرمان لوگوں کے اس حال پر غمگین مت ہو (وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرنا چاہتے اسلئے وہ اس محرومی کے مستحق ہیں)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھراتے رہے تاکہ اس افیون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے اور جب ان کی نئی نسل، جن کی تربیت مصر کی محکومی کی فضا سے الگ کر کے کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو اور وہ اپنے اندر اس صالحیت کو پیدا کرے جو وراثتِ ارض کے لئے شرط ہے، تو پھر ان کے ہاتھوں خدا کا نوشتہ پورا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اس نئی پود نے اپنے اندر صالحیت پیدا کر لی تو وہ ایک ہی جست میں تمام منازل طے کر گئے اور استخلاف فی الارض کی مسند پر متمکن ہو گئے۔ كَذٰلِكَ ۚ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (۲۶/۵۹)

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کیا جاتا تھا اسی کو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کر دیا، اور اس طرح تیرے اللہ کی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لئے کہ وہ ہمت اور استقامت سے جمے رہے تھے۔

یہ وراثت، صالحیت کا فطری نتیجہ تھی اور صالحیت، جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ایمان محکم اور عمل پیہم سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو قرآن نے "ایقان و صبر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (۳۲/۲۴)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی قیادت کرتے تھے

اور یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے ثبات و استقامت کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر محکم

یقین رکھتے تھے۔

یہ ہیں داستانِ بنی اسرائیل کے وہ اجزا جو ہمارے موضوعِ زیرِ نظر سے براہِ راست متعلق ہیں۔[1] اس میں استخلاف فی الارض (وراثتِ زمین) کے سلسلہ کی دو متمیز و بین کڑیاں سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جسے ابتدائی حصہ کہنا چاہئے جس میں غیروں کی محکومیت سے اس لئے رستگاری ملتی ہے کہ اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کے نمود و ارتقاء کے لئے امکانی مواقع مل جائیں، اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں صلاحیت کی پختگی کے بعد وہ قوم وراثتِ ارض کی مستحق قرار پاجائے۔ حصولِ صلاحیت کا ابتدائی مرحلہ ہو یا استخلاف و وراثت کا ثانوی حصہ، دونوں میں مواقع اس لئے بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قوم اس قدرت و اختیار سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ قوم اپنے اندر صلاحیت پیدا کرتی ہے یا نہیں۔ اور دوسرے میں یہ کہ قوت و اختیار ملنے کے بعد وہ قوم اس کا استعمال صحیح طور پر کرتی ہے یا نہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے، جبکہ وہ ابھی فرعون کے زیرِ حکومت تھی کہا۔ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۷/۱۲۹) قریب ہے کہ اللہ تمہیں استخلاف فی الارض عطا کردے۔ پھر دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ اور قومِ محمد رسول اللہ سے کہا گیا کہ

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ

وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ

خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰/۱۳-۱۴)

---

[1] داستانِ بنی اسرائیل اپنے اندر عبرت و موعظت کے ہزار سامان رکھتی ہے اور ہمارے حالات پر تو یہ اس طرح منطبق ہوتی ہے کہ جو باریک بیں نگاہ اسے دیکھے گی بیساختہ پکار اٹھے گی کہ ع اپنے دل ہی کی تو یہ داستان معلوم ہوتی ہے
اس داستان کی تفاصیل و تضمنات معارف القرآن جلد سوم میں ملیں گی۔ اس مضمون کا یہ حصہ بھی زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہے۔

اور یقیناً ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا جب ان کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ جادۂ عدل و انصاف سے ہٹ کر ظلم کرنے لگ گئے (حالانکہ) ان کے رسول ان کے پاس واضح حقایق لے کر بھی آئے لیکن بایں ہمہ ایسا نہ ہوا کہ وہ ایمان لے آتے۔ اس طرح ہم مجرم اقوام کو سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اُن کے بعد ہم نے تمہیں زمین کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو!

لہٰذا امکانی مواقع یا قوت و اختیار کے خزانے اس لئے ملتے ہیں لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔

ان اصول و مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد، اب اپنی موجودہ حالت کی طرف آیئے اور اسی آئینے میں اسے بھی دیکھئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں بغیر (صالحیت) کے مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے اندر قطعاً وہ داخلی تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئیں جن کا مظہر خارجی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ کیا عوام اور کیا خواص، ہم سب اسی سطح پر کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے صالحیت تو بہت بڑی چیز ہے، ہم میں تو وہ صلاحیت و استعداد بھی پیدا نہیں ہوئی جو محض مادی قوتوں کی بنا پر حصولِ مملکت و سلطنت کے لئے، زندہ رہنے کی تمنی قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ان قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جنھوں نے اپنے اغراض و منافع اور ذاتی مقاصد و مطامع کی خاطر، دوسروں کے نظامِ سلطنت سے رستگاری حاصل کرنے، یا اپنے تصورات کے مطابق بساطِ حکومت بچھانے کے لئے جدوجہد کی، اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں انھیں کیا کیا مصائب برداشت کرنے پڑے اور انھوں نے ان سب شدائد و نوائب کا کس پامردی و استقامت، حوصلہ اور ہمت، عزم و استقلال سے مقابلہ کیا اور اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر کس طرح مستانہ و جانفروشانہ انداز سے، ہر مخالف قوت کی صفیں چیرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ابھی کل کی جنگِ عمومی کو دیکھئے۔ محض ملکی حفاظت اور قومی اجارہ داریوں کی حصارت کے لئے مختلف اقوامِ مغرب نے کس کس ایثار و قربانی سے تامساعدت

حالات کا مقابلہ کیا۔ ان سب حقائق کو سامنے رکھئے اور۔ باز بخویشتن نگر۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہم میں فی الواقعہ عام قومی خصائص بھی پیدا نہیں ہوئے چہ جائے کہ ہمارے اندر صفاتِ الٰہیہ منعکس ہوں اور ہم صبغۃ اللہ کے مشہود پیکر دکھائی دیں۔

با دستے نرسیدی خدا چہ می جوئی

گذشتہ ابتلاء و انتشار میں، ہم نے ایک طرف جس عدمِ تدبر اور افلاسِ نظر اور دوسری طرف جس فقدانِ ضبط و استقامت اور حرمانِ عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا ہے۔ نہیں! اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ہم نے ایک طرف جن کفن دزدیوں اور مردار خوریوں، جن "یوسف فروشیوں" اور "یعقوب فریبیوں" اور دوسری طرف جن افراتفریوں اور نفسا نفسیوں، جن ضابطہ شکنیوں اور آئین فراموشیوں کا ثبوت دیا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادتیں ہیں کہ ہم اس وقت زندہ قوموں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل اور حکومت و مملکت کے مستحق کہلانے کے اہل قطعاً اور یقیناً نہیں ہیں۔ لہٰذا غیروں کی حکومت سے نجات اور اس خطۂ زمین کی موہبت محض انعاماً و احساناً ہوئی ہے، جس طرح بنی اسرائیل کی، فرعون کی غلامی سے رہائی اور سیناؔ کی وادیوں میں پرچم کشائی، محض اعزازاً و اکراماً ہو گئی تھی۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے کیا اسباب و ذرائع پیدا کئے گئے، اور احوال و ظروف کس طرح ایک خاص نہج و ترتیب پر متشکل ہوتے چلے گئے، یہ ایک الگ بحث ہے۔ حقیقت یہی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے کہ یہ نتائج جو اس طرح مرتب ہوئے ہیں، ہماری استعداد و اہلیت کا ماحصل، اور ہماری سعی و کاوش کا ثمرہ نہیں ہیں۔ یہ ہمیں بلا مزد و معاوضہ اور بلا محنت و مشقت خدا کی طرف سے احساناً ملے ہیں۔ اور ملے اس لئے ہیں "لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ"۔ غیروں کی حکومت میں ہمیں یہ مواقع حاصل نہیں ہو سکتے تھے کہ ہم اس صلاحیت کو پیدا کر سکیں جو وراثتِ ارض کے لئے بنیادی شرط ہے۔ یہ خطۂ زمین ان ہی مواقع کو بہم پہنچانے کے لئے عطا ہوا ہے۔ یہ کھلا میدان اس لئے دیا گیا ہے کہ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (تاکہ یہ دیکھا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، صالحیت مشروط ہوتی ہے ایمان و اعمال صالحہ پر، چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۲۹/۹)

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور (اس کے ساتھ) صالح العمل ہوتے ہیں تو ہم ان کو یقیناً صالحین کے زمرہ میں شامل کریں گے۔

اس حقیقت کو بھی قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی روش ہے۔ اس میں بڑی بڑی تکالیف کا مقابلہ اور شدید مصائب کا سامنا ہوگا۔ مومن وہی ہے جو ان مصائب کو مردانہ وار برداشت کرے۔ جو اس راہ میں تکالیف سے جی چرائے، وہ مومن نہیں، قرآن کی رو سے منافق ہے چنانچہ آیۂ مندرجہ صدر کے ساتھ ہی فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝ (۲۹/۱۰-۱۱)

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ (کی راہ) میں دکھ اٹھانا پڑتا ہے، تو لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر تیرے اللہ کی طرف سے نصرت آئے تو اس (فتح و کامرانی کے وقت) پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا اللہ نہیں جانتا جو اہل جہان کے سینوں میں ہے؟ (ضرور جانتا ہے) اور اللہ یقیناً مومنین کو بھی دیکھے گا اور منافقین کو بھی۔

سو صالحیت کے لئے پہلی شرط جسمانی قربانی ہے اور دوسری شرط مالی ایثار، جس کے متعلق فرمایا۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ

لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (۶۳/۱۰)

اور اللہ کے دیئے ہوئے میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ اس وقت کہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ میں مال خرچ کرتا اور اس طرح صالحین میں سے ہو جاتا۔

یہ اذیتیں اور مشقتیں، ظاہر ہے کہ مخالفین کے مقابلہ سے پیدا ہوں گی۔ یہ مخالفت دو اطراف سے ہوگی۔ ایک تو خارجی دشمنوں کی طرف سے جو اس امکانی قدرت (میدان عمل) کو بھی گوارا نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس خطۂ زمین پر ان کی حکومت مستقر و متمکن ہو گئی تو ان کا باطل آگیں نظام سب کا سب درہم برہم ہو جائے گا۔ باطل اپنی بنیادی کمزوریوں سے خوب واقف ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ نظامِ حق و صداقت کے قیام کی مخالفت میں پوری سعی و کاوش سے کام لیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی!

لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان خارجی اعدا کی مکارانہ سازشوں اور محاربانہ منصوبوں کے مقابلہ کے لئے ہر وقت مستعد رہنا ہوگا۔ کہ اگر ان کی کمزوری یا لاپرواہی سے خدانہ کردہ ان کے مشئوم عزائم بروئے کار آگئے تو یہ امکانی قدرت جسے صالحیت یعنی وراثتِ ارضی کے حصول کا ذریعہ بننا ہے، یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور کس قدر سوختہ ساماں اور شوریدہ بخت ہے وہ قوم، جس کی جھولی میں پڑی ہوئی ایسی متاعِ گراں بہا، اس طرح سے چھن جائے۔

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے
ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا

لیکن ان خارجی دشمنوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت خود اپنوں کی طرف سے ہوگی جو اس انقلاب سے اس لئے خائف ہوں گے کہ اس میں انھیں اپنی طمع کارانہ سیادت اور رابطہ فریبانہ قیادت کی موت نظر آئے گی۔ یہی وہ گروہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں، ہر دعوتِ انقلابِ حق و صداقت کی مخالفت

میں پیش پیش رہا ہے اور قرآن نے جسے مترفین کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ مترفین کے عناصر ترکیبی، ان کے نفسیاتی میلانات اور ذہنی رجحانات، ان کے خصائص و لوازم ان کے مقاصد و عزائم کیا ہوتے ہیں، یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سردست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ مترف کے مفہوم میں تن آسان، سہل انگار، نفس پرست، عیش پسند، دوسروں کی کمائی پر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی، سب داخل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ (۳۴:۳۴)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے کہا کہ ہم تمہارے پیغامِ حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں۔

ہر داعیٔ حق و صداقت کا پیغام، انقلاب آفریں و حریت بخش ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہنوں کے تراشیدہ نظام ہائے زندگی کو الٹ کر ان کی جگہ فطرتِ صحیحہ کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام کے تحت میں ان مترفین کو جو پشتہا پشت سے دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی نرم و نازک زندگی بسر کرتے چلے آتے ہیں، اپنے لئے پیغامِ موت نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں انھیں کسی تبدیلیٔ حالات کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس نہج و اسلوب پر قوم کا نظامِ معاشرت و تمدن چلا آرہا ہے اسی پر چلتا جائے۔

وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ۝ (۴۳:۲۳)

اور اس طرح ہم نے (اے رسولِ عربی) تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا کہ اس کے مترفین گروہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا ہے اسی کی تقلید میں ہم نجات و سعادت کی راہ دیکھتے ہیں۔

یہی وہ قوم کے اکابر ہیں جو ہر دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز اٹھاتے ہیں اس لئے

کہ انھوں نے اپنی ساحرانہ فسوں طرازیوں اور شاطرانہ فریب سازیوں سے قوم کو سکھایا ہی یہ ہوتا ہے کہ تم مرو تاکہ ہم زندہ رہیں، تم کماؤ تاکہ ہم تن آسانی کی زندگی بسر کریں، تم دکھ جھیلو تاکہ ہم سکھ اٹھائیں، تم سنو تو ہمارے کانوں سے، دیکھو تو ہماری آنکھوں سے، سوچو تو ہمارے دماغوں سے، سمجھو تو ہمارے دلوں کی راہ سے، چراغ تمہارے ہوں راتیں ہماری، زبان تمہاری ہو اور باتیں ہماری۔ تمہارے پسینے سے ہمارے گلستانوں میں آبیاریاں ہوں، اور تمہارے خون کی رنگینی سے ہمارے ایوانوں میں گلکاریاں۔ اس لئے ہر وہ تبدیلی جس میں سرِ خاک غریب کے لئے سامانِ زیست ہو اُن کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے، لہٰذا ان کی طرف سے مخالفت یقینی۔ یہی ازل سے ہوتا آرہا ہے، یہی ابد تک ہوتا رہے گا۔ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر، جب صحنِ زمین میں سب سے پہلی مرتبہ یہ آواز حضرت نوحؑ کی زبان سے اٹھی تو ان ہی اکابر نے اس کی مخالفت کی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۷/۶۰)

اس کی قوم کے اکابر نے کہا کہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو (اس دعوتِ انقلاب میں) ایک کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

اور اسی کو جب حضرت ہودؑ نے دُہرایا تو مخالفت کی اس صدائے بازگشت نے اس دعوت کی مزاحمت کی۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۷/۶۶)

اس کی قوم کے اکابر نے، جنھوں نے اس دعوت کی صداقت سے انکار کیا تھا، کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو حماقت میں مبتلا ہے اور جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

اور یہی وہ اکابرینِ قوم تھے جنھوں نے حضرت صالحؑ کی اس پکار کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۷/۷۶)

اس قوم کے مستکبرین نے کہا کہ جس بات پر تم ایمان لائے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہی جواب حضرت لوطؑ کو ملا۔ (۷/۸۲) اور اسی نہج سے حضرت شعیبؑ کی دعوتِ انقلاب کا استقبال ہوا

(۲۶:۶۸) یہی وہ اکابر و جابر قوم تھے جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دینے کی ٹھانی تھی۔ اور یہی قوم فرعون کے وہ متکبرین و مترفین تھے جنھوں نے فرعون کو حضرت موسیٰؑ کے قتل کرنے کی صلاح دی تھی۔ یہی وہ سیادت و قیادت کے اجارہ دار تھے جنھوں نے جناب مسیحؑ کو حوالۂ دار و رسن کرنے کی سازش کی تھی۔ اس لئے کہ وہ خدا کی بادشاہت کو غریبوں کا حصہ بتاتے تھے۔ اور پھر یہی وہ رؤساء و امراءِ عرب تھے جنھوں نے تمام عمر اس دعوتِ آسمانی کی سخت ترین مزاحمت و مخالفت کی جو حکومت و سلطنت کی کنجیاں مترفین سے چھین کر متقین کو دینے کے لئے بلند ہوئی تھی۔ یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہوگا۔ اس خطۂ زمین پر جسے ہم پاکستان سے تعبیر کرتے ہیں، جب اس انقلاب صحیحہ کی آواز اٹھے گی جو قوم میں صالحیت کا موجب بنے گا اور جس میں عزت و تکریم اور سیادت و امارت کے پیمانے بدل جائیں گے، تو اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز ان ہی مترفین کی طرف سے بلند ہوگی جو آج اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق از خود واجب الاحترام بنے بیٹھے ہیں اور جن کی کیفیت یہ ہے کہ یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳:۱۸۷) "وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ (محض زبان سے کہتے ہیں لیکن) کرتے نہیں، اس کے لئے ان کی تعریف کی جائے۔" انھیں مستقلاً اسانید عظمت و منابر عقیدت پر بٹھائے رکھا جائے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کی طرف سے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دینے والی ہر آواز کی مخالفت ہوگی۔ چونکہ اس زمانہ کی فضا میں عہدِ کہن کے شخصی استبداد کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے سیاستِ حاضرہ کے تقاضے یہ ہیں کہ زبان سے تغلب و تفوق اور استیلاء و استبداد کی مخالفت کی جائے لیکن نظام اس قسم کا قائم کیا جائے جس میں وہی تغلب و استیلاء موجود ہو یعنی روح وہی ہے لیکن اس کے پیکر بدل چکے ہیں، لات و منات وہی ہیں فقط ان کے لباس میں تبدیلی آ گئی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن، دولت و حشمت کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوت و دولت کے غلط استعمال سے، (اور ہر اس نظامِ معاشرت میں جو قرآنی خطوط پر متشکل نہ ہوگا،

ان کا استعمال غلط ہوگا) انسانی کردار میں ایسے عیوب و اسقام پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے قرآنی اسلوب و انداز کی زندگی ان پر سخت گراں گذرتی ہے۔ اس لئے مترفین کا گروہ اس انقلاب کی مخالفت و مزاحمت میں ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

فلہذا، پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ دوسرا مرحلہ، پہلے سے بھی زیادہ ہمت طلب اور حوصلہ آزما ہے۔ اگر انھوں نے اس باب میں جرأت و بسالت اور ثبات و استقامت سے کام نہ لیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ یہ بھی اسی قسم کی حکومت قائم کر لیں جیسی دنیا کی اور قومیں قائم کئے بیٹھی ہیں۔ لیکن یہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی حکومت بہر حال و بہر کیف، غیروں کی حکومت کے مقابلہ میں ہزار آئیں سود مند ہوتی ہے۔ اس لئے وہ زندگی، اس سے بیشتر کی زندگی سے یقیناً بہتر ہو گی۔ لیکن قرآنی زندگی نہ پہلے تھی، نہ یہ دوسری ہوگی۔ پہلی زندگی میں یہ معذوری تھی کہ ہمیں وہ امکانی مواقع کہاں میسر ہیں کہ ہم اپنے تصوراتِ صحیحہ کے مطابق نظام حکومت قائم کر سکیں۔ لیکن اب امکانی قدرت کے میسر آجانے سے وہ بات تو باقی نہیں رہی، اب ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہ ہوگا کہ ہم نے اپنی زندگی کی عمارت کو قرآنی خطوط پر تعمیر کیوں نہ کیا۔ قرآنی نکتہ نگاہ سے حکومت، مبدل بہ استخلاف و "وراثت" اسی صورت میں ہوتی ہے جب وہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنے جسے خالقِ کائنات نے نوعِ انسانی کے لئے تجویز کیا ہے اور جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)

یہ (صالحین) وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انھیں تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کریں گے، معروف کے احکام نافذ کریں گے اور منہیات سے روکیں گے۔ اور تمام امور آخر الامر خدا کیلئے ہوں گے

نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایسی محیط کل اور ہمہ گیر اصطلاحات ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی تبیین و تشریح اور تفصیل و توضیح کے لئے مستقل ابواب کی محتاج ہے۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآنی نظام کی پوری کی پوری بساطِ حکومت ان ہی چاروں گوشوں کے اندر

ہمٹ کر آ گئی ہے اور نظام صلوٰۃ ان میں عمودی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر قرآن نے نظام صلوٰۃ کی اضاعت کو نعمائے الٰہیہ کے چھن جانے کا موجب قرار دیا ہے۔ سورۃ مریم میں دیکھئے مسلم علیہ حضرات (علیہم التحیۃ والسلام) کے تذکار جلیلہ کے بعد فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹/۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نظام صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنی خواہشات ہی کی اتباع کرنے لگ گئے۔ سو وہ ہلاکت و بربادی کو پالیں گے۔

یہی ہیں وہ جن سے استخلاف فی الارض کی سی نعمت عظمیٰ چھن جاتی ہے۔ اور کیسے سوختہ بخت ہیں وہ لوگ جن سے ایسی متاع عزیز اس طرح چھن جائے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ۔

یہ ہے صالحیت پیدا کرنے کا نظام جس کا فطری نتیجہ وراثت ارض ہوتا ہے۔ اسے پیش نظر رکھئے اور پھر ایک نگاہ اپنے آپ پر ڈالئے اور ایسا کرتے وقت بنی اسرائیل کی اس واژگون بخت قوم پر بھی نگاہ رکھئے جس کے مقدرات کے ڈوبتے ہوئے ستارے ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی تکلیف آئی اور وہ لگے بڑبڑانے۔ کوئی بات خلاف منشا پیش آ گئی اور وہ بیٹھ گئے منہ بسور کر۔ قدم قدم پر یہ طعن کہ ہمیں خواہ مخواہ مصر سے نکال کر لے آئے۔ اس سے تو ہم قوم فرعون کی غلامی میں اچھے تھے! اور یہاں کیا حالت ہے؟ اگلے دنوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کالی جھنڈیاں لئے "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگاتے، جلوس کی شکل میں چلے جا رہے ہیں۔ ایک سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگا "میاں! تین دن ہو گئے ہیں پانی کا نل بند پڑا ہے۔ کوئی سنتا ہی نہیں۔ جہنم میں گیا ایسا پاکستان اور بھاڑ میں گئی اسلامی حکومت۔ کچھ وہاں مر گئے۔ جو باقی رہ گئے ہیں یہاں مارے جا رہے ہیں" دیکھئے یہ داستان کس طرح حرفاً حرفاً بنی اسرائیل کی داستان سے ملتی ہے اور قوم کس طرح ذرعاً ذرعاً اور شبراً شبراً ان کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ جس شخص سے بات کیجئے ایسا معلوم ہو گا گویا اس نے پاکستان میں آ کر کسی کی

ہفت پشت ہفتاد نسل پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن ان مصیبتوں کی برداشت میں ان کی طرف سے کچھ اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے گویا وہ یہ مصیبتیں کسی اور کی خاطر مفت میں جھیل رہے ہیں۔ انھیں قطعاً اس امر کا احساس نہیں کہ انھیں ایک ملکِ عظیم عطا ہوا ہے تاکہ وہ اس پر اپنی حکومت قائم کریں اور اگر انھوں نے ان مصائب و تکالیف کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کر لیا تو دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں ان کے قدم چومیں گی۔ یہ تو عوام کا حال ہے۔ خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے مل جانے سے سب کچھ مل گیا ہے اب کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔ بندوؤں کی یہ چند روزہ غوغا آرائی ختم ہو جائے تو وہ تختِ جہانداری و سریرِ جہانبانی پر کامل امن و سکون سے متمکن ہو جائیں گے۔ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

یاد رکھئے! یہ خطۂ زمین بجائے خویش کوئی شے نہیں۔ نہ یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی مٹی میں دفن ہونے سے جنت الفردوس کے مستحق بن سکتے ہیں۔ یہ محفوظ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ آپ اپنے خون سے اس کی حفاظت و صیانت کا سامان بہم پہنچائیں، اور پھر اس طرح محفوظ و مصئون ہونے کے بعد یہ جنتِ ارضی بھی اسی صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس پر خدا کی حکومت کا تختِ اجلال بچھائیں۔ وراثتِ ارض کا ابدی قانون صالحیت ہے اور خوف و حزن سے مامونیت و مصئونیت صرف اس کیلئے مقدر کی گئی ہے جو اپنے آپ کو قانونِ الٰہیہ کی حفاظت میں لے آئے اور اس طرح خود صالح بن جائے۔

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۷/۳۵)

پس جو کوئی اپنے آپ کو (قوانین خداوندی کی) حفاظت میں لے آئے اور اپنے اندر صالحیت پیدا کر لے اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ غم،

وذالك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔

(بقیہ لمعات از صفحہ ۹)

اس کے بعد ہم حکومت سندھ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے اس بات کا علم ہو جانے پر کہ ان کے صیغہ راز میں رکھے ہوئے کاغذات اس طرح باہر چلے گئے ہیں، اس باب میں کیا اقدام کیا ہے! ہم نہ کمیونزم کے طرفدار ہیں، نہ مسٹر مسعود کے وکیل۔ ہمارے سامنے یہ ایک اصولی بات ہے جس کے متعلق استفسار کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

۳۔ یوم اقبال کی تعطیل

ہم نے سابقہ اشاعت میں حکومت پاکستان کی توجہ ان کی اس فروگذاشت کی طرف دلائی تھی جس کی رو سے انھوں نے اس سال پھر یوم اقبال کی تعطیل کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ اس پرچہ کی ایک کاپی، ایک خط کے ساتھ محکمہ امور داخلہ حکومت پاکستان کی خدمت میں بھیجی گئی تھی۔ ابھی تک ہمیں نہ تو اس خط کا جواب موصول ہوا ہے نہ ہی اس امر کی اطلاع کہ حکومت نے اس فروگذاشت کا ازالہ کر دیا ہے۔ ہم ارباب متعلقہ کی توجہ ایک بار پھر اس سہو کی طرف مبذول کراتے ہوئے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلہ کا اعلان بہت جلد فرما دے کیونکہ اس کے سننے کے لئے ایک دنیا منتظر ہے۔

۴۔ وراثت ارض کا ابدی قانون

اس عنوان سے محترم پرویز صاحب کا ایک اہم مضمون اپریل ۱۹۴۸ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ مضمون اس قدر مقبول ہوا کہ اس پرچہ کی کوئی کاپی ہمارے پاس باقی نہ رہی حتیٰ کہ جو حضرات بعد میں خریدار ہوئے انھیں بھی اس پرچہ سے محروم رہنا پڑا۔ اس مضمون کی مانگ اس وقت سے آج تک برابر جاری ہے۔ اس تقاضائے شوق کے پیش نظر ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس مضمون کو دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اشاعت زیر نظر میں پیش خدمت ہے۔ جن حضرات کے پاس اپریل ۱۹۴۸ء کا پرچہ نہیں ہے وہ اپنے فائل میں اس مضمون کو شامل کر لیں۔